قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1977

اس پرچہ میں

انسانیت
کا
آخری سہارا

پرویز

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ۔ لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ــــ ۱۸ روپے غیر ممالک ــــ ۳ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۳۰	دسمبر ۱۹۷۷ء	شمارہ ۱۲

فہرست

۱ ۔ لمعات ۲
۲ ۔ استقبالیہ ۔ (بسلسلہ جشن تبویب القرآن) .. (محترم محمد اسلام صاحب) .. ۹
۳ ۔ بارگاہ قرآنی میں ــــ ہدیۂ تشکر ۔ .. .. (محترم پرویز صاحب) .. ۱۷
۴ ۔ انسانیت کا آخری سہارا .. .. " " " .. ۳۳
۵ ۔ ایک حسین اور سادہ تقریب (بسلسلہ جشن تبویب القرآن) ۶۱
۶ ۔ مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابوں کی کہانی .. .. "

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد ۔ مطبوعہ ۔ علمی پرنٹنگ پریس ۔ ۱۷ اسپتال روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

قرآنِ مجید (سورۂ کہف) میں ہے۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا۔ (۱۸/۱۰۳) "ان سے کہو کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ کون ہیں جن کا سب کیا کرایا اکارت جاتا ہے اور اس طرح وہ سب سے زیادہ نقصان میں رہتے ہیں؟" غور کیجئے۔ یہاں سب سے زیادہ نقصان میں رہنے والے ان لوگوں کو نہیں کہا جو کچھ نہیں کرتے۔ انہیں کہا گیا ہے جو کام تو کرتے ہیں لیکن ان کے کام نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ وہ رائگاں چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں ..... وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ (۱۸/۱۰۴) جو کام تو غلط کرتے ہیں لیکن اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بڑی کاریگری کر رہے ہیں۔ اس آیت میں لفظ صُنْعًا بڑا معنی خیز ہے۔ یعنی وہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں خلوص نہیں بلکہ تصنع ہوتا ہے۔ وہ حقیقی نہیں ہوتا مصنوعی ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ۔ جن کے اعمال۔ جن کے کام۔ بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ ایسے بے نتیجہ کہ: فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔ (۱۸/۱۰۵) ظہورِ نتائج کے وقت ان کے اعمال کے وزن کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں گے کہ ہمارا کچھ بھی وزن نہیں۔ ہمیں تولنے کی ضرورت ہی نہیں۔

"پاکستان اسلامی مملکت بنانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا" یہ الفاظ مملکتِ پاکستان کے ہر باشندے کی زبان پر ہیں، اور گذشتہ تیس سال میں، اسے غلط قرار دینا تو ایک طرف، کسی نے اس میں شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں نکالی۔ لیکن اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس تیس سال کے عرصہ میں اس مقصد کے حصول (یعنی اس مملکت کو اسلامی بنانے) کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے اس کا پرکاہ جتنا بھی وزن ہے؟ یہ نہیں کہ اس سلسلہ میں کچھ کیا نہیں گیا۔ آپ اس کی تیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اس تمام دوران میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جس میں اس ضمن میں کوئی نہ کوئی اسکیم نہ بنائی گئی ہو۔ کوئی نہ کوئی تحریک نہ اٹھائی گئی ہو۔ کوئی نہ کوئی تماشہ نہ رچایا گیا ہو۔ کوئی نہ کوئی ہنگامہ نہ برپا کیا گیا ہو۔ لیکن یہ سب حرکات بے نتیجہ رہیں۔ یہ تمام شور و غوغا اکارت گیا۔ یہ تمام اعمال ضائع گئے؟ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب قرآنِ مجید کی مذکورہ بالا آیت میں موجود ہے۔ یہ سب تصنع تھا، مبنی بر خلوص نہیں تھا۔ یہ سب مصنوعی تھا، حقیقی نہیں تھا۔ آپ ذرا نگاہِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس

تمام شور و غوغا کا ماحصل چند الفاظ تھے، بے معنی - چند اصطلاحات تھیں مبہم۔ ان الفاظ اور ان اصطلاحات کو بار بار دہرایا جاتا رہا، اور ——— نہ کسی نے پوچھا نہ کسی نے بتایا کہ ان الفاظ کے متعین معنی کیا ہیں؛ ان اصطلاحات کا مخصوص مطلب کیا ہے؟ کسی نے دو اور دو چار کی طرح یہ نہ بتایا کہ اسلامی مملکت کہتے کسے ہیں۔ اسلامی نظام ہوتا کیا ہے؟ جب بھی ضرورت پڑی۔ اور یہ ضرورت عوام کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے پڑتی تھی۔ وہی مصنوعی الفاظ دہرا دیئے۔ انہی مبہم اصطلاحات کو اُبھار دیا۔

یوں تو ہماری گذشتہ تیس سال کی ساری تاریخ اسی تلخ حقیقت کا مرقع ہے لیکن اس سلسلہ میں گذشتہ دو سال میں جو کچھ بالخصوص کیا گیا، وہ اس سعیِ لاحاصل کا ٹیپ کا بند ہے۔ اسلامی مملکت کا تصور اقبالؒ نے دیا اور اسے عملی پیکر قائدِاعظمؒ نے عطا فرمایا۔ ان دونوں نے نہایت واشگاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت کس بنیاد پر استوار ہوتی ہے اور اس کے خط و خال کیا ہوتے ہیں۔ یوں تو اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ ——— بالخصوص مقدم الذکر ——— کے نام سے، ملک میں متعدد ادارے، انجمنیں، اکادمیاں قائم چلی آ رہی ہیں، اور ان پر قوم کے لاکھوں نہیں، کروڑوں روپے صرف ہو چکے ہیں، لیکن ان کی سعی و کاوش کے رائیگاں جانے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت کا متعین نقشہ قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ یا کم از کم یہی بتایا ہے کہ اس کی اساس اور بنیاد کیا ہو گی۔ گذشتہ دو سال خود حکومت نے اس مقصد کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ پچھلا سال (۱۹۷۶ء) قائدِاعظمؒ کا سال۔ اور حالیہ (۱۹۷۷ء) اقبالؒ کا سال۔ ان دونوں سالوں میں، بڑے بڑے عظیم الشان جلسے ہوئے۔ مذاکرات ہوئے۔ سیمینار ہوئے۔ مباحثے ہوئے۔ مشاعرے ہوئے۔ مقالات لکھے گئے۔ کتابیں شائع ہوئیں۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن آپ ان تقاریب کا اہتمام کرنے والوں اور ان کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہانے والوں سے پوچھئے کہ اس دو سال میں، کسی تقریر، کسی تحریر، کسی مذاکرے، کسی سیمینار، حتیٰ کہ کسی مقالہ یا کسی تصنیف میں یہ بتایا گیا کہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ نے اسلامی مملکت کا جو تصور پیش کیا تھا، اس کا عملی نقشہ کیا ہے۔ یا کم از کم وہ عظیم عمارت استوار کس بنیاد پر ہو گی؟ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی بھی اس سوال کا متعین جواب نہیں دے سکے گا۔ جیسا کہ آپ نے طلوعِ اسلام کے صفحات پر سینکڑوں بار دیکھا ——— اور جیسے ہم آئندہ سطور میں ایک بار پھر دہرا رہے ہیں ——— اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ دونوں نے کہا تھا ——— اور ایک بار نہیں، سینکڑوں مرتبہ کہا تھا ——— کہ اسلامی مملکت کی عمارت قرآنِ مجید کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ آپ ان سے پوچھئے کہ اس دو سال کے عرصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں قرآن مجید کا لفظ کتنی بار آیا ہے؟ اقبالؒ یا قائدِاعظمؒ کا "سال" قرآن کے تذکرہ کے بغیر ایسا ہی ہے جیسے، انگریزی محاورہ میں کہا جاتا ہے "ہیملٹ کا ڈرامہ، شاہزادہ کے بغیر" ——— قرآن مجید کو بیچ میں سے نکال دیجئے تو نہ اقبالؒ کی عظمت باقی رہتی ہے نہ قائدِاعظمؒ کی رفعت۔ نہ پاکستان کے جداگانہ مملکت رہنے کا جواز باقی رہتا ہے، نہ اس کے اسلامی ہونے کا امکان ——— باقی رہ جاتی ہے (اقبالؒ کے الفاظ میں) وہ صناعی جو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری

سے عبارت ہوتی ہے۔ گذشتہ سال سے، قوم کی نگاہوں کو اسی صناعی سے خیرہ کیا جا رہا ہے۔[1]

علامہ اقبالؒ نے کس طرح اپنی ساری عمر قرآنِ مجید کے پیغام کے عام کرنے میں صرف کر دی، اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں ۱۹۳۸ء سے لے کر آج تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ہزاروں صفحات کو محیط ہوگا۔ ہم اس مقام پہ چند ایک اختصارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا آغاز مثنوی اسرار و رموز سے ہوتا ہے۔ وہ اس میں درخشندہ الفاظ میں لکھتے ہیں :-

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم

اور اس کے بعد اس کتابِ عظیم کی عظمت و رفعت اس انداز سے سامنے لاتے ہیں کہ انسان کی روح وجد میں آجاتی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس سوال کا جواب اقبالؒ نے خود (اس مثنوی کے آخر میں) اس دعا کی شکل میں دے دیا تھا جس سے زیادہ اثر انگیز دعا شاید ہی کوئی اور ہو۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ :-

گر دلم آئینۂ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
تو — روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ! — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
اور — گر درِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
تو — در عمل پائندہ تر گرداں مرا — آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اور اس حسین آغاز کے بعد، وہ تمام عمر، امت کی توجہ اسی کتابِ عظیم کی طرف مبذول کراتے رہے۔ فکرِ اقبالؒ کے کئی گوشے ایسے ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ان کے پیش کردہ نکات میں تضاد بھی پایا جاتا ہے کہ ان کی فکر بالآخر ایک انسان کی فکر تھی جس میں سہو و خطا بھی ہوتا ہے اور بالیدگی و ارتقا بھی۔ لیکن جو کچھ انہوں نے قرآن کے متعلق کہا ہے اس میں نہ اختلاف کی گنجائش ہے نہ شائبہ تضاد۔ ایک ہی پیغام ہے جسے وہ مختلف انداز سے دہراتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں اس انداز سے کہ :-

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

کہیں ان الفاظ میں کہ :-

جز بقرآں ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
اور — چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اس سے ذرا آگے ہے :-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبالؒ)

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

کہیں قرآن اور تلوار کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند!

پیامِ مشرق کے ابتدا میں، مومن سربراہِ مملکت کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

حکمرانے بود و سامانے نہ داشت دستِ او جز تیغ و قرآنے نہ داشت

کہیں اس میں ایک اور عنصر کا اضافہ کر کے کہتے ہیں :-

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

وہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی پر خون کے آنسو روتے اور با صد نالہ و فغاں کہتے ہیں کہ :-

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است ملت اندر خاکِ او آسودہ است
رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد یا مسلماں مرد، یا قرآں بمرد؟
صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب العجب۔ ثم العجب ثم العجب

ہم اپنے زوال اور پستی کا روز رونا روتے ہیں۔ اس کے اسباب کی تحقیق و تفتیش کے لئے انکوائری کمیٹیاں بٹھاتے ہیں۔ لیکن حضرت علامہؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ :-

خوار از مہجوریِ قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

وہ اس پستی سے اُبھر کر مہِ بامِ ثریا تک پہنچنے کا طریق یہ بتاتے ہیں کہ :-

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ!

وہ مذہبی پیشوائیت اور اربابِ طریقت کو جھنجھوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :-

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

وہ بالآخران تمام تفاصیل و اطناب کو سمیٹ کر ایک شعر میں سمو دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ :-

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پیغام فی ذاتہٖ ایسا مکمل ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

انہوں نے اپنے اشعار ہی میں اس حقیقت کو واشگاف نہیں کیا، بلکہ جہاں اور جب بھی انہیں موقعہ ملا قرآن مجید کی اہمیت اور خود اکتفائیت کو ہر رنگ اور ہر کیفیت نمایاں کرتے چلے گئے۔ اپنے بیانات میں۔ خطبات میں۔ تقاریر میں۔ حتیٰ کہ دوستوں اور ہمنواؤں کے نام خطوط میں اسے دہراتے رہے۔

وہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں، گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے عازم لندن ہوئے تو راستے میں دہلی میں رُکے ـــــ وہاں شمس العلماء مولانا سید احمد (مرحوم) امام جامع مسجد، نے صوبہ مسلم کانفرنس کی طرف سے ایک سپاس نامہ ان کی خدمت

میں پیش کیا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:۔

جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے۔ نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے، جس پر میں اپنی سیاسی بحثوں کی اساس قائم کروں۔ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآنِ پاک) ہے جس کی روشنی میں میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔

(گفتارِ اقبالؒ۔ محمد رفیق افضل۔ ص۱۳۶)

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ کی طرف آیئے۔ انہوں نے بھی جب سے تحریکِ پاکستان کی شمع ہاتھ میں لی، اس حقیقت کو برابر دہراتے رہے کہ اس مملکت کی بنیاد قرآنِ مجید کے اصول و قوانین ہوں گے اور اس کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوگی۔ اس موضوع پر بھی ہم متعدد بار، تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ اس مقام پر بطور تجدید یادداشت، چند ایک اقتباسات دہرائے جاتے ہیں۔

اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِ اعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہ نمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتابِ عظیم ——— قرآنِ مجید۔ (تقاریرِ جناح۔ جلد اوّل۔ ص۵۱۶)

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام پیغامِ عید کے سلسلہ میں فرمایا:۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحر اطلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں:۔

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزہ مرّہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا ——— ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس

رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہی نہیں۔)

(تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۸۶)

انہوں نے ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن) کے طلباء کو جو انٹرویو دیا تھا، وہ طلوعِ اسلام کے صفحات پر تو بار بار چھپ چکا ہے لیکن "قائدِ اعظمؒ سال" کی تقریبات کے سلسلہ میں وہ کسی جگہ ہماری نظروں سے نہیں گذرا۔ چونکہ وہ ہمارے خیال میں اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہم اُسے (بلا معذرت) ایک بار پھر دہراتے ہیں:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

آپ "نظریۂ پاکستان" کے الفاظ گذشتہ تیس سال سے مسلسل سنتے چلے آ رہے ہیں، لیکن کیا آج تک کسی نے یہ بتایا ہے کہ وہ نظریہ ہے کیا؟ وہ نظریہ وہی جسے قائدِ اعظمؒ نے مندرجہ بالا چند الفاظ میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ یہی ہے وہ نظریہ جسے عملی شکل دینے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان قائم کی تھی۔

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ پاکستان میں علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے متعلق اتنا کچھ کہا اور لکھا گیا ہے کہ اسے یکجا کرنے سے کاغذوں کے انبار لگ جائیں۔ اس انبار میں اور تو سب کچھ ہوگا لیکن وہ عظیم حقیقت، جو ان دونوں محسنینِ ملّت کی دعوت کا نقطۂ ماسکہ اور اساس و بنیاد تھی، اس کا کہیں ذکر نہیں ملے گا۔ یعنی قرآنِ مجید کا کہیں نام تک نہیں آیا۔ یہ سہو یا فروگذاشت نہیں۔ اس کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہے کہ پاکستان میں قرآنی نظام نافذ نہ ہونے پائے اس لئے کہ اس سے آمریت، سیکولرازم، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ یہاں دو ہی رجحانات کارفرما ہیں۔ ایک سیکولرازم اور دوسرے تھیاکریسی۔ سیکولرازم کے معنی ہیں، انسانوں کو بلا حدود و قیود، قانون سازی کے اختیارات حاصل ہونا۔ یعنی مغرب کا جمہوری نظام اور تھیاکریسی کے معنی ہیں، زمامِ حکومت کا مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں دیا جانا۔ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے، قرآن کی تلوار سے ان ہر دو تصورات کی جڑ کاٹ دینے کے لئے مملکتِ پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں "مُلّا" کی مخالفت میں جو کچھ کہا ہے وہ درحقیقت تھیاکریسی کی مخالفت ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے فروری ۱۹۴۸ء میں، بہ حیثیت گورنر جنرل پاکستان، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں واضح طور پہ کہا تھا کہ:-

یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پاکستان میں علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے نام سے جو کچھ کیا جا رہا ہے

اس میں ان کے سرچشمۂ فکر و تصوّر ـــــ قرآن مجید ـــــ کا نام کہیں نہیں آنے پاتا! اور اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہوگی کہ ان ہر دو مشاہیرِ کرام کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے وہ نتیجہ خیز کیوں نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے، وہ قرآن کے الفاظ میں تصنع ہے۔

ملک کے جن "دانشوروں" کو اس مقصد کے لئے آگے بڑھایا جاتا ہے آپ ان کی فہرست پر نگاہ ڈالیئے۔ ان میں کچھ تو مغرب کے نظامِ جمہوریت (سیکولرازم) کے قائل ہوں گے اور کچھ روس یا چین کی سوشلزم (یا کمیونزم) کے حامی۔ اگر کسی کو اسلام کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا جائے گا تو وہ عام طور پر اسی اسلام کا مؤید ہوگا، جسے ہمارا قدامت پرست طبقہ اسلام کہہ کر پکارتا ہے اور جس کے علمبردار بالعموم وہ حضرات ہیں جن کا تعلق اُن علماء سے تھا جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی آخری دم تک مخالفت کی تھی۔ آپ سوچیئے کہ یہ حضرات، اقبالؒ یا قائداعظمؒ کے تصورِ پاکستان کو کسی صورت میں بھی پیش کر سکتے ہیں؟ ان کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کا ملخص یہ ہوتا ہے کہ:۔

> ہندوستان میں مسلمانوں نے ہزار کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہیں لیکن ہندو کی تنگ نظری نے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ انہوں نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس سے مجبور ہو کر اقبالؒ نے علیحدگی کی اسکیم پیش کی اور قائداعظمؒ نے اسے عملی شکل دیدی۔ اسی سے دو قومی نظریہ اور مملکتِ پاکستان کا تصور وجود میں آیا۔ اگر ہندو ذرا بھی کشادہ ظرفی اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیتا تو ملک کو تقسیم کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

یعنی مسلمانوں کا ایک جداگانہ قوم ہونے، اور ان کے لئے ایک علیحدہ مملکت قائم کرنے کی کوئی مثبت وجہِ جواز نہیں تھی۔ یہ ہندو کی تنگ نظری کے خلاف منفیانہ ردِ عمل تھا۔ اس منطق کا . . . . نتیجہ ظاہر ہے۔ یعنی اگر ہندو آج بھی یہ کہدے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کشادہ دلی کا سلوک کرے گا، تو پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہِ جواز باقی نہیں رہتی۔ یہ ہندوستان کے ساتھ دوبارہ ضم ہو سکتا ہے۔

یہ ہے جو کچھ یہاں اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نام سے کیا جا رہا ہے۔ اور اس پر لاکھوں روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ ایسے لوگوں کے نتائج بے نتیجہ رہ جاتے ہیں لیکن یہاں معاملہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ یہاں یہ تمام سعی و عمل، تخریبی نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ یہاں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جنہوں نے اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا زمانہ دیکھا ہے اس لئے وہ اُن کے تصورات کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔ ان کے بعد، ہماری نئی نسل کو اتنا کچھ بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا اور ان کی معلومات کا سارا انحصار اس تاریخ پر ہوگا جسے وہ "دانشور" مرتب کر رہے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے اس مملکت کا کیا حشر ہوگا اس کے لئے کسی انجم شناس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مشرقی پاکستان اسی لئے ہندو سے جا ملا تھا کہ وہاں اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصورات کو عام نہیں کیا گیا تھا۔ اگر وہی صورتِ حالات یہاں بھی رہی تو نتیجہ ظاہر ہے۔

بسلسلۂ جشنِ تبویب القرآن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

استقبالیہ

واجب الاحترام باباجی۔ بھائیو اور بہنو۔ السلام علیکم!

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے۔ آج کی یہ حسین و سادہ سی تقریب، مفکرِ قرآن، محترم پرویز صاحب کی مائیہ ناز، گراں قدر اور گراں بہا تصنیف، تبویب القرآن کے تعارف کے سلسلہ میں منائی جا رہی ہے۔ یہ میری انتہائی خوش بختی ہے کہ ایسے روح اور پاکیزہ اجتماع میں استقبالیہ پیش کرنے کی سعادت میرے حصے میں آئی ہے۔ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس میں داخل ہوئے ہیں تو پہلے سے طے شدہ باریوں کی رو سے، غلام اونٹ کے اوپر سوار تھا اور حضرت عمرؓ مہار تھامے آگے آگے پیدل چل رہے تھے۔ وہاں جو، غلام، غلام ہی تھا اور عمرؓ، عمرؓ ہی۔ کچھ ایسی ہی صورت، میں اس وقت دیکھ رہا ہوں۔ اس محفل میں مجھ سے کہیں زیادہ قابل، کہیں زیادہ مستحقِ احترام اور کہیں زیادہ بزرگ ہستیاں تشریف فرما ہیں۔ ان کی موجودگی میں اس شرف کا میرے حصے میں آنا؛ بس اس غلام کے اُشتر سوار ہونے کے مانند ہے۔ ورنہ، من کہاں اور یہ مقام کہاں!

عزیزانِ گرامی قدر! اللہ تعالےٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی راہ نمائی کا عطا کرنا اپنے ذمے لیا! یہ راہ نمائی حضرات انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے دوسرے انسانوں تک پہنچتی رہی۔ تا آنکہ اس کی تکمیل حضور خاتم النبیین (صلے اللہ علیہ وسلم) کے مقدس ہاتھوں سرانجام پائی۔ حضورؐ کی وساطت سے اللہ تعالےٰ نے وہ ضابطۂ حیات عطا فرمایا جو ہر طرح سے مکمل بھی تھا اور غیر متبدل بھی۔ یہ ضابطۂ حیات عطا فرمایا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود ہی لے لی۔ یہ نوعِ انسان پر اتنا بڑا احسانِ خداوندی تھا جس کی سپاس گذاری سے یہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

قرآنِ مجید کیا ہے؟ ہر قسم کی مفاد پرستی اور استحصال کے خلاف اعلانِ جنگ۔ حضور نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس کتابِ عظیم کی روشنی میں ایسا نظام قائم کر دیا جس سے ہر نوع کے سلب و نہب اور لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو گیا۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ اس وقت تو مفاد پرست قوتیں بے بس ہو کر رہ گئیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے پھر آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا اور اس

نظامِ خداوندی کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ انہیں اچھی طرح سے علم تھا کہ یہ انقلاب قرآنِ مجید کا برپا کردہ ہے۔ اس لئے ان کی تجویز اور تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح قرآن کو مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے۔ اس سازش کی پہلی کڑی یہ تھی کہ خدا کی اس کتاب کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ اگر وہ اس سازش کو اپنے الفاظ میں اجاگر کرتے تو انہیں کبھی کامیابی نصیب نہ ہو سکتی۔ اس کے لئے انہوں نے جھوٹی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتب احادیث اور تاریخ کے اندر اس چابکدستی سے داخل کر دیا کہ وہ عینِ اسلام بن گئیں۔ ان روایات کی رو سے انہوں نے پہلے یہ مشہور کیا کہ رسول اللہؐ قرآنِ مجید کو ایک مرتب کتاب کی شکل میں دے کر نہیں گئے تھے۔ یہ مختلف لوگوں کے پاس ہڈیوں، پتھروں، کھجور کے پتوں وغیرہ پر اس انداز سے منتشر تھا کہ کچھ آیتیں ایک کے پاس۔ کچھ کسی اور کے یہاں، کچھ یہاں کچھ وہاں۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق کے زمانے میں، اور بعض روایات کی رو سے، حضرت عمر فاروقؓ اور بعض کی رو سے حضرت عثمانؓ غنی کے عہد میں ان بکھرے ہوئے اجزاء کو اکٹھا کر کے اسے کتاب کی شکل دی گئی۔ اس مجموعے کے قابلِ اعتماد ہونے کی کیا کیفیت تھی، اس کا اندازہ اس روایت سے لگائیے جس میں کہا گیا ہے کہ اس میں وہ ایسی آیتیں درج ہی نہیں تھیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ جیسے صحابی کہتے تھے کہ حضورؐ کے زمانے میں وہ ان کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ان آیات کو تلاش کرتے کرتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ میرے بچے! میں ان آیات کی بابت کیا بتاؤں۔ یہ کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی تھیں جو کمرے کے اندر پلنگ کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ کی وفات پر گھر میں افراتفری مچی، تو ہماری بکری رسّی تڑا کر اندر چلی گئی اور ان پتوں کو کھا گئی — چنانچہ وہ آیتیں کہیں نہ مل سکیں۔ ان میں آیتِ رجم بھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ آیتیں قرآن میں تو اب درج نہیں کی جا سکتیں، البتہ عمل ان کے مطابق ہی کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ جو زنا کی سزا رجم (سنگسار کرنا) بتائی جاتی ہے اس کا حکم موجودہ قرآنِ مجید میں نہیں۔ یہ سزا اُسی آیت کے مطابق دی جاتی ہے جسے بکری کھا گئی تھی۔

آپ غور فرمائیے کہ جس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے لی تھی اس کے متعلق ہماری روایات کیا کہتی ہیں اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان روایات کو آج بھی صحیح مانا جاتا ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ روایات میں یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم کا جو نسخہ اس طرح مرتب ہوا جسے مصحفِ عثمانیؓ کہا جاتا ہے، مختلف صحابہؓ کے پاس قرآنِ کریم کے ایسے نسخے بھی تھے جن میں اور مصحفِ عثمانی میں متعدد آیات میں اختلاف تھا۔ یہ اختلافات دو چار یا دس بیس مقامات تک محدود نہیں تھے۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ انہیں اختلافِ قرأت کہا جاتا ہے۔ وہ نسخے اب الگ الگ کتابوں کی شکل میں تو موجود نہیں لیکن کتب روایات میں وہ اختلافی آیات موجود ہیں۔ آپ نے قرآن مجید کے ترجموں یا تفاسیر میں اکثر لکھا دیکھا ہوگا کہ (مثلاً) حضرت ابنِ عباسؓ کی قرأت میں یوں آیا ہے۔ ان سے وہی اختلافی آیات مراد ہیں۔ اور انہیں بھی ایسا ہی صحیح سمجھا جاتا ہے جیسا کہ موجودہ قرآن مجید میں درج شدہ آیات کو۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سے قرآنِ کریم کی محفوظیت کی کیفیت کیا رہ جاتی ہے!

ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ بعض آیات ایسی بھی تسلیم کی جاتی ہیں جو قرآنِ کریم میں تو درج نہیں لیکن ان کا حکم جاری ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں یہ عقیدہ بھی مروج چلا آرہا ہے کہ بے شمار آیات ایسی ہیں، جو قرآنِ مجید میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ ان کا حکم خدا نے منسوخ نہیں کیا۔ قرآنِ مجید میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اس آیت کو فلاں آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ انہیں علماء کرام نے منسوخ قرار دے رکھا ہے۔ کسی زمانے میں ایسی آیات کی تعداد پانچ سو تک پہنچتی تھی۔ مگر یہ چھٹنی شروع ہو گئی۔ لیکن اب بھی ایسی آیات ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ صرف قرأت کے لئے ہیں۔ حکم ان کا منسوخ ہو چکا ہے۔

پھر یہ عقیدہ وضع ہوا کہ اللہ کی طرف سے جس قدر وحی حضورؐ پر نازل ہوئی تھی وہ سب کی سب قرآنِ مجید میں درج نہیں۔ قرآنِ کریم میں اس کا بہت تھوڑا حصہ درج ہے باقی وحی احادیث میں درج ہے۔ یعنی ان احادیث میں جو رسول اللہ کی وفات کے قریب دو اڑھائی سو سال بعد انفرادی کوششوں سے جمع اور مرتب ہوئی تھیں ان احادیث کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے چھ صحیح ترین کتابیں سُنیوں کی ہیں، اور چار شیعہ حضرات کی۔ ان احادیث کے متعلق اتنا ہی عقیدہ نہیں کہ یہ قرآن مجید کی تشریح کرتی ہیں عقیدہ یہ بھی ہے کہ حدیثیں قرآنِ مجید کے احکام کو منسوخ بھی کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ہماری مروجہ شریعت میں کئی احکام ایسے ہیں جو قرآنِ مجید کے خلاف ہیں۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کے حکم کو حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ احادیث کے متعلق یہ عقیدہ بہرحال مسلم ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر کرتی ہیں۔ چنانچہ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآنِ مجید کی کسی آیت کی ایسی تفسیر جو کسی روایت کے خلاف ہو، قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتی۔ یہ روایات قرآنی آیات کی کس انداز کی تفسیر پیش کرتی ہیں اس کی تفصیل میں جانے کا میرے پاس وقت نہیں، میں مثال کے طور پر صرف ایک آیت کی تفسیر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ قرآنِ کریم میں نہایت شرح و بسط سے بتایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کو کس کس انداز سے ستاتے اور ان کے لئے موجبِ اذیت بنتے تھے۔ ان کی اس روش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ مجید نے جماعتِ مومنین سے کہا کہ "تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسےٰؑ کو اذیت دی تھی" (سورۂ احزاب آیت ۶۹) اس آیت کی تفسیر میں بخاری شریف میں لکھا ہے:

> حضرت ابوہریرہؓ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے اور ایک، دوسرے کی طرف دیکھتا تھا۔ حضرت موسےٰؑ تنہا غسل کیا کرتے تھے تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ، موسےٰؑ کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے اس کے سوا کچھ مانع نہیں کہ فتق (یعنی آنت اترنے کی مرض) میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا اور حضرت موسیٰؑ اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے۔ ثوبی یا حجر۔ ثوبی یا حجر۔ اے پتھر میرے کپڑے دیدے۔ اے پتھر میرے کپڑے دے دے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسےٰ علیہ السلام کو (برہنہ)

دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں۔ اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسےٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم حضرت موسیٰؑ کی مار سے اس پتھر پر چھ یا سات نشان اب تک باقی ہیں۔

یہ حدیث بخاری میں موجود ہے۔ میں نے اس کا اُردو ترجمہ اس کتاب سے درج کیا ہے جسے نور محمدؐ کارخانہ تجارتِ کتب کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کی جلد اوّل ص۷۶ پر یہ حدیث ۲۶۷ نمبر کے تحت موجود ہے۔

یہ ہے نمونہ اس تفسیر کا جو کتب احادیث پیش کرتی ہیں۔ ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ (بخاری اور مسلم کی) کسی ایک حدیث کا انکار بھی مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر آپ حضرت موسےٰؑ کے متعلق مذکورہ بالا روایت کو سچا نہ سمجھیں تو ان حضرات کے فتوے کی رُو سے آپ اسلام کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ——— احبار و رہبان خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (۹/۳۴)

میں نے اس مختصر سے وقت میں جو کچھ عرض کیا ہے آپ اس پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا یہ عقائد اور روایات قرآنِ مجید کے راستے میں روک بن کر کھڑے نہیں ہیں؟ کیا ان کی موجودگی میں انسان اس قرآن تک پہنچ سکتا ہے جسے اللہ تعالےٰ نے حضورؐ نبی اکرم پر نازل فرمایا تھا۔ لیکن میں نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے وہ احبار کے متعلق ہے۔ احبار کے معنی علماء ہیں۔ رُہبان نے اس سلسلہ میں کیا کیا، وہ اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ رُہبان سے مراد مشائخ یا اربابِ تصوف ہیں۔ انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ قرآنِ کریم کے حقیقی معنی وہ نہیں جو اس کے الفاظ سے متبادر ہوتے ہیں۔ اس کے حقیقی معنی اس کے باطن میں پوشیدہ ہیں اور وہ صوفیا کرام کو خدا کی طرف سے براہِ راست الہام ہوتے ہیں اور انہی کے اندر سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ چلئے! اس سے وہ قرآن جسے خدا نے عربی زبان میں نازل کیا تھا سارے کا سارا بیکار ہو کر رہ گیا۔ حقیقی قرآن وہ ہے جو ان حضرات کے سینوں میں مستور چلا آتا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس سازش کی نہایت مختصر الفاظ میں دلخراش داستان، جو اُمت کو قرآن سے بیگانہ رکھنے کے لئے نہایت سادگی اور ہوشیاری سے بروئے کار لائی گئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اُمت میں قرآن کا مصرف صرف اتنا رہ گیا کہ ثواب کے لئے اس کی تلاوت کر لی جائے۔ ختم درود میں اس کی آیتیں پڑھ کر مُردوں کو بخش دی جائیں۔ ایک ایک رات میں اس کے ختم کئے جائیں۔ جہاں تک مروّجہ اسلام کا تعلق ہے اس میں قرآن کا ذکر محض تبرکاً آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے دارالعلوموں میں عالم بننے کے لئے دس یا کم از کم سات سال کا نصاب مقرر ہے۔ اس نصاب میں صرف سورۃ البقرہ پڑھائی جاتی ہے۔ وہ بھی ایک قدیم تفسیر کی رو سے اور بس۔

اس جگر خراش داستان کے بعد اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ مشہور ہے کہ حضورؐ نبی اکرم نے فرمایا تھا کہ مجھے ہند کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ سند کے اعتبار سے اس روایت کی کیا حیثیت ہے اس کے متعلق تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن واقعات اس کی شہادت ضرور دیتے ہیں۔ قرآن کریم کے ساتھ ہزار سال سے وہ کچھ ہو رہا تھا جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے لیکن اس کے خلاف کہیں سے کوئی مؤثر آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ اگر کبھی آواز اٹھی بھی تو اسے اس طرح کچل دیا گیا کہ وہ صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ اِس کے خلاف مؤثر آواز پچھلی صدی میں سرسید علیہ الرحمتہ نے اٹھائی، اور پوری جرأت کے ساتھ بھرپور انداز سے اٹھائی۔ انہوں نے کہا کہ قرآنِ مجید پر علم و بصیرت کی روشنی میں غور و تدبر کر کے اسے ادہام پرستیوں کے چنگل سے آزاد کرانا چاہیئے۔ جس طرح کلدانیوں کے بتکدہ میں تیشۂ براہیمی نے طوفان برپا کر دیا تھا اسی طرح سرسیدؒ کی اس آواز سے تہلکہ مچ گیا اور اس کے خلاف کفر کے فتوؤں کے انبار لگ گئے۔ جب ان حضرات کا مقامی فتوؤں سے جی نہ بھرا تو یہ مکہ معظمہ سے فتوے لے آئے۔ لیکن سرسید نے ہمت نہ ہاری۔ وہ عملی انسان تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ملتِ اسلامیہ اس لئے تباہیوں کے گڑھے میں جاگری ہے کہ غلط قسم کی مذہب پرستی نے اسے عالمِ کردار سے بیگانہ بنا رکھا ہے۔ انہوں نے اس میں تازہ زندگی پیدا کرنے کے لئے قرآنِ مجید کے اس حصے کو زیادہ نمایاں کیا جس میں تسخیرِ فطرت کی تاکید کی گئی تھی۔ سرسیدؒ نے اس کے لئے "نیچر" کا لفظ استعمال کیا تھا کیونکہ یہی اصطلاح اس زمانے میں زیادہ مشہور تھی۔ آپ یہ سن کر شاید اپنی ہنسی نہ روک سکیں کہ مذہب پرست طبقہ نے انہیں "نیچری فرقہ" کا بانی قرار دے کر، اس فرقے کے خلاف کفر و الحاد کے فتوے صادر کر دیئے۔ سرسیدؒ اپنی مہم میں کامیاب رہے جس کا جیتا جاگتا ثبوت مملکتِ پاکستان کا وجود ہے جس کے وہ معمارِ اوّل تھے۔

سرسیدؒ کے بعد یہ شمع اقبالؒ کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے خدا کی اس کتابِ عظیم کی عظمت اور اہمیت کو اس انداز سے اجاگر کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ ان کا سارا کلام اسی پیامِ حیات آور کی نشید جانفروز ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے پیغام کا ذریعۂ ابلاغ شعر قرار دیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ذریعۂ ابلاغ بڑا مؤثر ہوتا ہے لیکن اس کا ہدف جذبات ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی فکری نظام مرتب نہیں۔ علامہ اقبالؒ کو اس کمی کا خود احساس تھا اور اس لئے وہ قرآنِ کریم کے مطالعہ کے سلسلہ میں نثر میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن ذرائع کے فقدان اور ان کی صحت کے نقصان نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی اور اس طرح ملت ایک متاعِ جلیل سے محروم رہ گئی۔ لیکن انہوں نے قرآنی نظام کے احیاء کے لئے مملکتِ پاکستان کا جو تصور عطا کر دیا۔ اس نے اس فکر کے عملی پہلوؤں کی نشاندہی کر دی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ کفر کے فتوؤں سے اقبالؒ بھی نہیں بچ سکے تھے۔

حضرتِ علامہؒ کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء میں ہو گئی تو اس وقت بظاہر قرآنی فکر کو آگے بڑھانے والا کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن دایۂ فطرت نے اِس سے بہت پہلے، ایک شمع بردار کی پرورش شروع کر رکھی تھی۔ یہ تھے اُس زمانے کے ——— **چودھری غلام احمد پرویز** ——— انہوں نے قرآن فہمی کا طریق فیضانِ اقبالؒ سے اخذ کیا تھا اور خاموشی ہی خاموشی میں اس پر عملی کام بھی کافی عرصہ

سے شروع کر رکھا تھا۔ یہ کیسے ہوا تھا اس کے متعلق وہ جس واقعہ کا ذکر اپنے حلقۂ احباب میں کیا کرتے ہیں وہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ یہ بخل ہوگا اگر میں اپنے سامعین کو اس سے محروم رکھوں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ جب حضرتِ علامہ نے بتایا کہ قرآن فہمی کا طریق "محاورۂ عرب اور تصریف آیات" ہے تو میں نے تلاش کیا کہ آیا اس نہج پر پہلے کوئی کام ہوا ہے، اس میں جب مجھے ناکامی ہوئی تو میں نے اس زمانے کے کم و بیش تمام جید علماء کی توجہ اس طرف منعطف کرائی۔ ان میں سے ہر ایک نے اس کی اہمیت کا تو اعتراف کیا لیکن عملاً کام کرنے کے لئے کوئی بھی آمادہ نہ ہوا۔ اس پر میں نے حضرتِ علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کام کے لئے کوئی آدمی بھی تیار نہیں ہوتا تو انہوں نے عریضہ کے حاشیہ پر یہ لکھ کر اسے میرے پاس واپس بھیج دیا کہ اگر کچھ وقت کے لئے تم ہی آدمی بن جاؤ تو کیا حرج ہے؟ میں اس سے سناٹے میں آ گیا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں لکھا کہ میں اپنی علمی استعداد کی کوتاہ دامنی اور اس پروگرام کی وسعت اور مشکلات سے واقف ہوں۔ میں اس کی ہمت کیسے کر سکتا ہوں؟ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ تحریر فرمایا، اس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے پاس ایک ننھا سا مٹی کا دیا ہے جس کی روشنی دو چار قدم سے آگے نہیں جاتی اور سامنے ایک تیرہ و تار، لق و دق صحرا ہے۔ تم ڈرتے ہو کہ اس دیئے کی روشنی میں یہ طویل سفر کیسے طے ہو سکے گا۔ تمہارا یہ ڈر اس لئے ہے کہ تم اس دیئے کو لے کر کھڑے ہو ـــــ اسے اپنے سامنے رکھ کر چل پڑو ـــــ تمہارے آخری قدم تک راستہ روشن ہوتا چلا جائے گا ـــــ معلوم نہیں ان الفاظ میں کیا جادو تھا کہ میں کچھ اور عرض کئے بغیر، بسم اللہ کہہ کر چل پڑا۔ مجھے اس تیرہ و تار صحرا میں چلتے ہوئے چالیس پینتالیس سال کا عرصہ ہو چلا ہے۔ یہ ننھا سا دیا نہ صرف راستے کی تاریکیوں کو چیرتا چلا گیا۔ بلکہ جس طرح جوں جوں موٹر چلتا جاتا ہے اس کی بتیوں کی روشنی تیز تر ہوتی جاتی ہے، خود یہ دیا بھی ایک جگمگاتا قندیل بن گیا ـــــ مفاد پرست طبقہ کی مخالفت کے جھکڑوں کے علی الرغم!

میں عزیزانِ من! ان مخالفتوں کی تفصیل میں جا کر اس جگمگاتی محفل کو دھندلانا نہیں چاہتا۔ میں تو جب بھی ان پر نگہ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ مردِ درویش انہیں برداشت کس طرح کر گیا۔

اس فرہادِ قرآن نے عزیزانِ من! قوم کو جو کچھ اس چالیس سال کے عرصہ میں دیا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ آنے والا مؤرخ ہی لگا سکے گا۔ ہم تو چونکہ ان کی اس خارہ شگافی کا مشاہدہ برسہا برس سے خود کر رہے ہیں اس لئے یہ باور کرتے ہی بنتی ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ تنہا خود کیا ہے۔ ورنہ کوئی دوسرا اسے بمشکل تسلیم کر سکے گا کہ ایک فرد، تنہا بغیر کسی معاون و مددگار کے، بغیر کسی مادی سہارے کے۔ اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود، جس میں قریب تیس سال کی ملازمت بھی شامل ہے۔ اتنا کچھ کر سکتا ہے! اس سلسلہ میں پرویز صاحب ایک دلچسپ واقعہ سنایا کرتے ہیں۔ لغات القرآن کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد، ایک عراقی عالم ان سے ملنے آیا۔ اس نے کہا کہ ہم نے اپنے ہاں ممتاز علماء اور ادبا پر مشتمل ایک ادارہ قائم کیا ہے تاکہ وہ قرآن مجید کا ایک لغات مرتب کریں۔ میں اس ادارہ کی طرف سے مختلف ممالک کا دورہ کر رہا ہوں یہ معلوم

کرنے کے لئے کہ اس سلسلہ میں کہیں کچھ کام ہوا ہو تو اس کی تفصیلات حاصل کر سکوں جو ہمارے پیش نظر پروگرام میں ممد و معاون ہوں۔ آپ کی لغات القرآن ہماری نظروں سے گذری ہے۔ میں اسی سلسلہ میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ اس کے بعد اس نے، یوں کہیئے کہ مجھے ایک سوالنامہ دیا جس میں پوچھا گیا تھا کہ جس جماعت نے آپ کا لغات القرآن تیار کیا ہے اس میں کون کون سے حضرات شامل تھے۔ یہ جماعت کتنا عرصہ تک اس پر کام کرتی رہی، اس پر صرف کیا آیا اور فنڈ کہاں سے مہیا ہوئے، اس کی طباعت کا کام کس پبلشنگ ادارہ نے کیا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سوالات کے جواب میں مختصر الفاظ میں بتایا کہ اس لغات کی ترتیب کے لئے نہ کوئی جماعت تھی نہ کوئی ادارہ۔ اسے تنہا میں نے مرتب کیا ہے۔ میں نے قریب تیس سال تک ملازمت بھی کی ہے۔ جن کتابوں سے یہ الماریاں بھری پڑی ہیں وہ بھی میری اپنی تصنیف کردہ ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ماہوار مجلہ برسوں سے شائع ہو رہا ہے جس میں ہزارہا صفحات پر مشتمل میرے مضامین شامل ہیں۔ ہفتہ وار درس قرآنِ کریم کا سلسلہ بھی برسوں سے جاری ہے۔ ان کتابوں کو ہم پبلش بھی خود ہی کرتے ہیں اور اپنے اخراجات سے کرتے ہیں۔ ہمیں کہیں سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی۔

میں اس کے بعد کسی کام کے لئے اندر چلا گیا۔ باہر آیا تو دیکھا کہ وہ صاحب کوئی بات کہے بغیر (MOST UNCEREMONIOUSLY) اٹھ کر جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھی میرے جاننے والے تھے۔ اس وقت تو میں نے ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں، ان سے دریافت کیا کہ کیا بات تھی جو وہ صاحب اس طرح اٹھ کر چلے گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی باتیں سن کر انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ شخص غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ حقیقت چھپاتا ہے۔ اس قسم کے لغت کا مرتب کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ وہ بھی اتنے قلیل عرصہ میں۔ اور اس کے ساتھ وہ یہ سب کچھ بھی کرے جس کا اس نے ذکر کیا ہے۔ اور پھر ملازمت بھی کرتا ہو! لہٰذا جو شخص اصل حقیقت چھپا رہا ہو اس سے بات کرنے سے کیا فائدہ!

وہ سراسر سچا تھا۔ اس نے اس مردِ آہن کے پیکرِ خاکی ہی کو دیکھا۔ اس کی نگاہ ان شعلوں تک نہیں پہنچ سکی جو اس پیکر کے اندر قرآنی عشق نے فروزاں کر رکھے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ خالص سے متعلق جو کچھ اور جتنا کچھ اور جس نوعیت کا، اس مفکر نے تنہا قوم کو دیا ہے ہماری پوری تاریخ میں، انفرادی طور پر تو ایک طرف، بہ ہیئتِ مجموعی بھی کہیں اور نہیں ملتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا وہ ننھا سا دیا اب آفتاب عالمتاب بن چکا ہے جس کی شعاعیں دور دور تک پھیلی ہیں۔ اب یہ چراغ کسی کے بجھائے، بجھ نہیں سکتا۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا اس کی روشنی اور پھیلتی جائے گی۔

میں نے شروع میں کہا ہے کہ قرآنِ مجید نے بتایا ہے کہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، احبار و رہبان ــ یعنی علماء و مشائخ ــ کھڑی کرتے ہیں۔ اس کا عملی ثبوت ہمیں خود اپنے ہاں سے ملتا ہے۔ مبداءِ فیض کی کرم گستری سے ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین میسر آ گیا تھا جس میں صدیوں کے بعد، قرآنی نظام کے قیام کا امکان روشن تھا۔ اس نظام کے خط و خال نہایت واضح طور پر

ہمارے سامنے آچکے تھے۔ ان کی نشر و اشاعت، پرویز صاحب نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔ اس کے بعد یہاں قرآنی نظام کے قیام میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت اس کے راستے میں روک بن کر کھڑی ہوگئی اور انہوں نے پرویز صاحب کے خلاف ایسا پروپیگنڈہ کیا جس سے انہیں (WET - PAINT) بنا دیا گیا۔ پرویز صاحب کے سامنے اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا اس لئے اس سے ان کا تو کوئی نقصان نہ ہوا لیکن اس مملکت میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان بہت پیچھے ہٹ گیا۔ اگر یہ حضرات، قرآن کی راہ میں روک بن کر کھڑے نہ ہو جاتے تو یہاں یہ نظام کب کا قائم ہو چکا ہوتا۔ یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہے۔

اس کے باوجود ہمارا دور اس اعتبار سے اپنی اس خوش بختی پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے کہ اس میں قرآنی حقائق کا اس قدر گراں بہا ذخیرہ اُسے بلا مزد و معاوضہ میسر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم اپنے آپ کو خاص طور پر صاحبِ نصیب سمجھتے ہیں کہ جنہیں قرآن کریم کے اس درجہ بلند پایہ محقق اور عظیم مفکر کے قرب کی سعادت حاصل ہوگئی۔ اس قسم کی دولتِ جاوید کسی قیمت پر بھی خریدی نہیں جا سکتی۔

ادارہ طلوعِ اسلام کا انداز یہ رہا ہے کہ محترم مفکرِ قرآن کی جب بھی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی تو وہ ایک خاص تقریب کے انعقاد سے، طلوعِ اسلام کنونشن میں اس کا تعارف کراتے۔ ان کی مایۂ ناز تصنیف مبوّب القرآن کے دیکھنے کے لئے برسوں سے ہماری آنکھیں ترس رہی تھیں۔ امسال اس کی اشاعت نے مراحلِ تکمیل تک پہنچے تو مستقبل قریب میں کنونشن کے انعقاد کے امکانات روشن نظر نہ آئے۔ اس سے ہمیں کچھ مایوسی سی ہوئی کہ اس عظیم تصنیف کے شایانِ شان اس کا تعارف نہ ہو سکے گا لیکن ادارۂ طلوعِ اسلام نے ہمیں اس باب میں مایوس نہیں ہونے دیا۔ اس نے بہ تمام عجلت، اس تقریب کا انتظام کر دیا جس میں طلوعِ اسلام کی بزموں کے نمائندگان اور اراکان بھی شامل ہیں اور ان کے علاوہ فکرِ قرآن کے دیگر وابستگانِ دامن بھی۔ میں اپنی طرف سے، تمام بزموں کی طرف سے اور دیگر اربابِ ذوق کی طرف سے ادارۂ طلوعِ اسلام کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و سپاس گذاری پیش کرتا ہوں۔ اولاً اس لئے کہ انہوں نے دن و رات کی محنت و کاوش سے اس قدر ضخیم کتاب کو اتنے قلیل عرصہ میں اس حسن و رعنائی سے شائع کر دیا۔ اور ثانیاً اس لئے کہ انہوں نے اس کی رونمائی کے لئے ایسی جمیل و لطیف تقریب کا اہتمام کر دیا۔

باقی رہے ہمارے باباجی۔ تو میں تو ان کی موجودگی میں اس استقبالیہ کے پیش کرنے کی بھی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا چہ جائیکہ انہیں مخاطب کر کے کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں! میں اپنے قلب و نگاہ کی تمام توانائیوں کو مرتکز کر کے، کچھ ہمت کر سکتا ہوں تو فقط اتنا کہنے کی کہ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں   میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

والسلام

محمد اسلم

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کراچی

(۱۸ نومبر ۱۹۷۷ء)

باسمہٖ تعالیٰ

بارگاہِ قرآنی میں ـــــ ہدیۂ تشکّر

ـــــ بتویب القرآن کی تعارفی تقریب پر خطاب ـــــ

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بارگاہِ قرآنی میں ـــــ ہدیۂ تشکر

ابدی باد بہارِ نو کہ در انجمنت
کفِ خاک آمدم و جوشِ بہاراں رفتم

عزیزانِ گرامی قدر و رفیقانِ محترم ـ سلام و رحمت!

یوں تو انسانی زندگی سلسلۂ روز و شب ہی سے عبارت ہے لیکن اس سلسلہ میں بعض گھڑیاں ایسی بھی آ جاتی ہیں جنہیں بجا طور پر سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی قسم کی ایک گھڑی آج سے قریب دس سال پہلے وجہ تابانیٔ قلب و نگاہ ہوئی تھی جب وابستگانِ فکرِ قرآنی نے، میرے ہفتہ واری درسِ قرآن کے دورِ اول کے اختتام پر ایک جشن منایا تھا۔ اب انہی وارفتگانِ ذوقِ قرآنی نے اسی قسم کی ایک اور تقریب کے لئے وجہ جواز پیدا کر لی ہے۔ اصل یہ ہے کہ شدتِ شوق اپنی نمود کے لئے راہیں تراش لیتی ہے۔ انہی کو تقاریب کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے، یہ تقریب ہے میری عمر بھر کی محنت کا ماحصل 'تبویب القرآن' کا جشنِ تعارف۔ میں نے افہام و تفہیمِ قرآن مجید کے سلسلہ میں جس طول و طویل سفر کا آغاز آج سے قریب چالیس سال پہلے کیا تھا، تبویب القرآن کے متعلق میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کی آخری منزل ہے، کیونکہ معلوم نہیں مشیتِ ایزدی کے پروگرام میں کیا ہے۔ لیکن یہ اس سلسلۂ زریں کی (LATEST) کڑی ہے۔ میں آج کی تقریب میں کم و بیش وہی الفاظ دہراؤں گا جن سے میں نے ...... آج سے دس سال پہلے کے اجتماع سے خطاب کیا تھا، کہ یہ دونوں تقاریب درحقیقت ایک ہی سکہ کے دو رُخ اور ایک گہر کے دو پہلو ہیں۔

جیسا کہ میں اکثر و بیشتر عرض کر چکا ہوں، میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں، اور یہی میری متاعِ حیات اور مایۂ افتخار ہے۔ میری زندگی کا ابتدائی دور، قدامت پرستی کی تنگ ناؤں میں گزرا۔ کبھی مسجد کے حجروں میں قال اقول کی بحث و جدل میں اور کبھی خانقاہوں کے خلوت کدوں میں منازلِ تصوف کی رہ نوردی میں۔

یہ وہ دَور تھا جس میں، چشم بند و گوش بند و لب بہ بند، معراجِ علم۔ اور بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید، اوجِ روحانیت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب میرے شعور کی آنکھ بیدار ہوئی تو فکر و تدبر کی تابندہ شعاعوں نے جمود کی اُن برفانی سِلوں کو آہستہ آہستہ پگھلانا شروع کیا جو کورانہ تقلید اور اندھی عقیدت کے یخ خانہ کی فطری پیداوار تھیں ــــ میں، عقل و فکر کے چراغ گُل کر دینے والی ماضی پرستی کے تیرہ و تار غاروں سے نکل کر، تیشۂ فہم و فراست سے اپنی راہیں آپ تراشنے کی دعوت دینے والی تابناک وادیوں میں کس طرح پہنچا، اسے میں اپنی کتاب "شاہکارِ رسالت" کے ابتدائیہ میں بیان کر چکا ہوں۔ ان وادیوں میں پہنچ کر، جب جمود و تعطل کی برفانی سلیں پگھلنی شروع ہوئیں تو ان کے نیچے دبی ہوئی شکوک و شبہات کی پھانسیں یوں اُبھرنے لگیں جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف، ورق کو آگ کے سامنے لانے سے ایک ایک کر کے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں، یہ دَور میری زندگی کا تلخ ترین زمانہ تھا۔ اس میں وہ جنت مجھ سے چھن رہی تھی جو فسونِ خود فریبی کی تخلیق تھی، اور فردوسِ یقین آفریدہ کی طرف جانے والا راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ ریب و تشکیک کے سانپ متواتر ڈستے چلے جاتے تھے اور ان کے زہر کا تریاق کہیں سے میسر نہیں آتا تھا۔ میرے سابقہ ایمان کا ایک ایک گوشہ، اعتراضات کے طوفانوں کی نذر ہوتا جا رہا تھا، اور دلیل و برہان کی کوئی دیوار ایسی نہ تھی جو ان کی یورشوں کو تھام سکے۔ میں تحیّر کی ان وادیوں میں برسوں مارا مارا پھرتا رہا۔ عدمِ یقین کے نشتروں سے میرا قلب، بہ رنگِ غنچہ لبریزِ جراحت، اور فقدانِ طمانیت کی برق سامانیوں سے میرا سینہ پروردۂ آغوشِ محشر بنا رہا۔ یہ ویسا ہی دور تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

شکوک و شبہات کی ان تلاطم خیزیوں میں صرف ایک، روشنی کا مینار تھا جس نے میری کشتیٔ امید کو نذرِ طوفان ہونے سے بچا لیا۔ یہ مینار، یہ لنگر، یہ ساحل تھا حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر میرا یقینِ محکم۔ جب اعتراضات کی اضطراب انگیز موجیں، قدامت پرستی کے پیش کردہ 'خدا، وحی، آخرت' کے تصورات پر ایمان کو متزلزل کرنے کے لئے اٹھتیں تو صرف یہ خیال ان کے راستے میں حائل ہو جاتا کہ جس انسان کی سیرت ایسی بلند ہو وہ نہ تو خود فریبی کا شکار ہو سکتا ہے، نہ فریب دہی کا مرتکب۔ اس لئے اس نے جن حقائق کے مبنی بر صداقت ہونے کی شہادت دی ہے انہیں پرکھے بغیر جھٹک نہیں دینا چاہیئے ــــ یہ تھا عزیزانِ محترم، سیرتِ محمدیہ پر میرا ایمان، جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ موڑ دیا اور میں نے سابقہ توہمات سے خالی الذہن ہو کر، قرآنِ کریم کو علم و بصیرت کی روشنی میں از خود سمجھنے کی کوشش شروع کی۔ اس ہمت طلب سفرِ زندگی، اور صبر آزما مراحلِ حیات میں مجھے کس کس قسم کی سنگلاخ زمینوں سے گزرنا پڑا، اور ان میں مجھے کہاں کہاں سے راہ نمائی ملی؛ کیسی کوہ کنی اور خارہ شگافی سے میرا واسطہ پڑا، اور میں نے کس جگر سوزی اور نفس گدازی سے راستے کے ان موانعات کو دور کیا۔ ان کے متعلق میں

صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ میں قریب چالیس سال سے مسلسل قرآنِ کریم پر غور و فکر کرتا چلا آ رہا ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج، بہ کمالِ عجز و نیاز لیکن بہ تمامِ حتم و یقین، اس حقیقت کے اعلان کرنے کے قابل ہوں کہ خدا کی اس کتابِ جلیل کے ایک ایک لفظ کی صداقت پر میرا محکم یقین ہے۔ اور یہ ایمان علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براہین پر استوار ہے۔ اس نعمتِ کبریٰ کے حصول پر جہاں میرا سرِ نیاز، بحضورِ رب العزت سجدہ ریز ہے، وہاں میری جبینِ شوق، اس ذاتِ اقدس و اعظم، اس چراغِ آفرینش، اس شاہدِ دین و جانِ ایمان (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بارگاہِ عزت مآب میں سراپا سپاس ہے، جس کے حسنِ سیرت کی جلوہ باریوں نے میری نگاہوں کو وہ نورِ بصیرت عطا کر دیا جس سے میں، قرآنی حقائق پر یقینِ محکم سے علیٰ وجہ البصیرت مسلمان ہونے کے قابل ہو گیا۔ اور صرف مسلمان ہونے کے قابل ہی نہیں بلکہ خدائے زندہ کی اس کتاب پائندہ کے متعلق، جو ہر چشمِ بینا کے لئے بہارِ عید اور ہر گوشِ نصیحت نیوش کے لئے نوروزِ شنید ہے، اقبالؒ کی ہم نوائی میں یہ کہنے کے قابل بھی کہ ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

جب اس کتابِ عظیم کے حقائق، حجلۂ ذہن کو منور کرتے ہیں تو اس کا ایک ایک ذرہ جوشِ انا الشرق سے رشکِ صد آفتاب ہو جاتا ہے، اور جب اس کے بصائر، خلوت گاہِ قلب کو وسعت آشنا کرتے ہیں تو خونِ رگِ حیات کا ایک ایک قطرہ دعوائے انا البحر سے آفاق گیر و کائنات در آغوش ہو جاتا ہے۔ قرآن، مذہبی دنیا کی جنتر منتر کی کتاب یا خیالی پند و نصائح کا مجموعہ نہیں۔ یہ وہ ضابطۂ قوانین ہے جس کے مطابق یہ سارا کارگہِ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ وہ میزانِ عدل ہے جس میں افراد اور اقوام کے ایمان تلتے اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قوم اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی ہے، اسے اس دنیا میں بھی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہو جاتی ہیں اور وہ مستقبل (آخرت) کی خوشگواریوں اور شادکامیوں سے بھی نوازی جاتی ہے۔ جو اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرتی ہے، وہ یہاں بھی ذلیل و خوار ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی رو سیاہ و شرمسار ——

خَسِرَ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ۔ (۲۲/۱۱)

قرآنِ کریم پر غور و تدبر ہی سے میں نے، عزیزانِ گرامی قدر! اس ارشادِ خداوندی کو بھی سمجھا کہ جس شخص کو قرآن فہمی کی توفیق عطا ہو جائے، اس پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔ اس ارشادِ خداوندی کی روشنی میں میں نے یہ اپنی ذمہ داری سمجھی کہ —— دیکھا ہے جو کچھ میں نے، اوروں کو بھی دکھلا دوں۔ چنانچہ میں گزشتہ قریب چالیس سال ہی سے، اپنی بساط کے مطابق، اس فریضہ کی ادائیگی میں بھی مصروف چلا آ رہا ہوں۔ میری تصانیف، میرے مقالات، میری تقاریر، میرے درس، سب اسی فریضہ کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں —— میری یہ تمام کوششیں

اپنی اپنی جگہ مستقل افادی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان میں لغات القرآن اور مفہوم القرآن سرِفہرست آتی ہیں۔ لغات القرآن، قرآنی الفاظ کی ڈکشنری نہیں۔ یہ قرآنی تعلیم کا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے، اور جن اربابِ ذوق نے اس کا بہ نگہ تعمق مطالعہ کیا ہے، ان کی رائے ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد، قرآن فہمی کے سلسلہ میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ اس کے بعد مفہوم القرآن، ان دشواریوں کو دور کر دیتا ہے جو ترجموں کے ذریعے قرآن مجید کے سمجھنے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ان دونوں کے بعد، اب مجھے تبویب القرآن پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جس کی اشاعت پر، بطور تحدیثِ نعمت، یہ الفاظ بے ساختہ میری زبان پر آ جاتے ہیں کہ ——— شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم ——— تفصیل اس کی آپ پہلے سن چکے ہیں۔ مجھے اس میں کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ میں کچھ اہم نکات قرآن اور قرآن فہمی کے سلسلہ میں سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس میں جو قوانین و احکام اور اصول و اقدار مذکور ہیں وہ محکمات ہیں۔ یعنی ان کا مفہوم متعین ہے۔ لیکن ان کی تائید و شہادت میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ تشبیہات و استعارات کے انداز میں سامنے لائے گئے ہیں جنہیں اپنی اپنی علمی سطح کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے۔ ان حقائق کا تعلق، خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان حقائق کے ادراک کے لئے، کائنات اور انسانی دنیا سے متعلق مختلف علوم تک دسترس ضروری ہے لیکن یہ بھی واضح ہے کہ کسی ایک فرد کے لئے مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ اُسے ان جملہ علوم پر کامل دستگاہ حاصل ہو۔ اُسے چند ایک علوم پر عبور، اور دیگر علوم کی مبادیات سے واقفیت تو ہو سکتی ہے، وہ علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا ——— بنا بریں، قرآنی حقائق کا کماحقہٗ ادراک، ایک فرد کا نہیں، ایک جماعت کا کام ہے۔ لہٰذا، کسی فرد کو بھی اس کا دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ قرآنی حقائق کے متعلق اس نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ وہ اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ اس نے ان حقائق کا ادراک اپنی بصیرت کی حد تک کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ خود علمِ انسانی کی کیفیت یہ ہے کہ جوں جوں حقائقِ کائنات منکشف ہوتے جاتے ہیں، ان علوم کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جوں جوں علمِ انسانی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، قرآنی حقائق نکھر اور اُبھر کر سامنے آتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں خود قرآن کریم نے کہا ہے کہ:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳)

ہم خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ تا آنکہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت بن کر ان کے سامنے آ جائے۔

اس سے واضح ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق کے حقائقِ مستور بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کی صداقتیں مشہود ہوتی چلی جائیں گی۔ لہٰذا، انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جانا تھا وہ سمجھا جا چکا ہے۔ اس میں نہ اصلاح و ترمیم ہو سکتی ہے نہ حک و اضافہ ——— جس طرح

علومِ سائنس کے متعلق ریڈنگ یونیورسٹی کے طبیعیات کے پروفیسر، ڈاکٹر جیمز آرنلڈ نے کہا ہے کہ:

دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔

اسی طرح، قرآنی حقائق کے متعلق بھی بجا طور پر کہا جائے گا کہ اس ضمن میں۔

حرفِ آخر، آخری انسان کے حصے ہی میں آ سکتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش

می دہد قرآں جہانے دیگرش!

یہ وجہ ہے کہ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔ اور اس میں سہو و خطا کا کوئی دخل نہیں۔ یہ افہام و تفہیمِ قرآنی کی بہرحال ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے۔ نہ ہی میرا فہمِ قرآن کسی کے لئے سند اور حجت قرار پا سکتا ہے۔

میں اسے پھر دہرا دوں کہ میں نے جو ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنی حقائق کو ہر دور کے انسانی علم کی سطح تک سمجھا جا سکتا ہے، یہ تو ان حقائق کے متعلق ہے جنہیں قرآنِ کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں استعارات کے انداز میں بیان کیا ہے جس کتاب کو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہونا تھا اس کے حقائق کو تشبیہات و استعارات کے انداز ہی میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی کا تعلق ہے، اسے قرآن نے متعین انداز میں بیان کر دیا ہے جس میں نہ ابہام ہے نہ اختلاف۔ وہ نہایت واضح، متعین، اور صاف و سادہ ہے جس سے نہایت آسانی سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

جہاں تک قوانین کا تعلق ہے، قرآنِ کریم نے بجز چند احکام، باقی قوانین کے لئے صرف اصول دیئے ہیں۔ اور انہیں ہر دور کی ملتِ اسلامیہ پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کرے۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی حدود کے اندر مرتب کردہ جزئی قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ یہ قوانین اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہوں گے۔ اسی کو اسلامی فقہ یا شریعت کہا جاتا ہے۔ قرآنی مملکت میں کسی فرد یا افراد کی کسی جماعت کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ فقہی قوانین مرتب یا نافذ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا تصور ہی نہیں مسلمانوں میں یہ تصور، ان کے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ جب دین نے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بنا دیئے گئے تھے۔

ان غیر متبدل اصولوں کو، قرآنِ کریم نے اقدار (VALUES) سے تعبیر کیا ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۔ (۹۷/۱) ہم نے اِسے اُس دور میں جب دنیا آسمانی روشنی سے محروم ہو چکی تھی، نئی اقدار کا حامل بنا کر نازل کیا۔ غور فرمایئے، عزیزانِ من کہ قرآنِ کریم نے اس ایک لفظ (قدر) میں کتنے عظیم حقائق کی دنیا سمٹا کر رکھ دی ہے۔ حیوان اور انسان میں خطِ امتیاز، اقدار (VALUES) کا تصور ہے۔ حیوان صرف اپنی طبیعی ضروریات کا احساس رکھتے ہیں۔ وہ اقدار (VALUES) کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ طبیعی ضروریات کا بھی احساس کرتا ہے اور اقدار کا تصور رکھنے کے قابل بھی ہے۔ جب کسی معاشرہ میں اقدار کا تصور گم ہو جائے یا مدھم پڑ جائے، تو وہ معاشرہ انسانوں کی بستی نہیں رہتا، حیوانات کا ہجوم بن کر رہ جاتا ہے جہاں صرف جنگل کے قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اپنے احکام کی طرح ان اصول و اقدار کو بھی نہایت واضح اور متعین انداز میں بیان کیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا ابہام و اختلاف نہ رہے۔ انہیں ہر شخص، جو قرآن کی زبان سے واقف ہو، بادنیٰ غور و تدبر، نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

لیکن قرآن فہمی کے سلسلہ میں، ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جو "پل صراط" کے عمومی تصور کے مطابق "بال سے باریک اور تلوار سے تیز" ہوتا ہے کہ وہاں سے اگر ذرا پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے گڑھوں میں جا گرے۔ وہ نازک ترین مرحلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص نظریہ یا تصور کو ذہن میں لے کر قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اِس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے، خواہ وہ کیسا ہی ہو، تو اسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے جو اس کے لئے ہر دو عالم میں وجہ روسیاہی ہوتی ہے۔ قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرکِ عظیم ہے۔ یہ اپنا دروازہ اس کے لئے کھولتا ہے جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ، خالی الذہن ہو کر، اس کے آستانِ عالیہ پر دستک دے۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ ماڈرن مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطعون کرتا ہے کہ یہ مغرب کے نظریات کو ذہن میں رکھ کر قرآن سے ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ یہ ان تمام نظریات و معتقدات کو، جن کی سند صرف اس قدر ہے کہ وہ قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں، ایمان کا درجہ دے کر، قرآن کو ان کے تابع رکھتے ہیں۔

ماڈرن طبقہ تو کوئی ایک آدھ نظریہ مستعار لے کر قرآن کی طرف آتا ہوگا، یہ حضرات پورے کے پورے قرآن کی تفسیر اپنے فرقہ کے معتقدات کے تابع کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، قرآنِ کریم کی ایک قدیم تفسیر (مدارک) کا اُردو ترجمہ شائع ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کے مدرّس مولانا سید انظر شاہ صاحب نے اس ضمن میں لکھا:

> صدیوں سے ہمارا سرمایۂ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختۂ مشق ہے۔ یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علماءؒ کے قلم سے تیار ہوتے رہے۔ کوئی بری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقہ سے ہو خوش آئند ہے۔ جس جماعت کی جانب سے ہو قابلِ پذیرائی ہے۔ مگر افسوس "علم" جیسے لازوال، ابدیت نشان، سب کی دولت، سب کے سرمایہ کو ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث کی طول طویل کتابیں

بھی بن گئیں۔

اقتباس کے اس حصہ سے آپ نے خیال کیا ہوگا کہ یہ صاحب اس کے خلاف ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر کسی فرقہ کے تابع کی جائے۔ لیکن ایسا نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ :-

> بہرحال جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خالص حنفی نقطۂ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔ (طلوع اسلام - مارچ ۱۹۶۹ء - صا۴۱)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرات قرآن کریم کی طرف آتے ہیں تو کس مقصد کو دل میں لئے ہوئے؟ اس مقصد کو کہ قرآن مجید سے اپنے فرقہ کے معتقدات و مسلک کی تائید حاصل کی جائے! جو تفاسیر اس نقطۂ نگاہ سے لکھی جائیں ان سے قرآن کریم جس قدر سمجھ میں آ سکتا ہے، ظاہر ہے۔ ہماری تمام تفاسیر اسی زاویۂ نگاہ سے لکھی جاتی ہیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے بصد آہ و فغاں کہا تھا کہ :-

زمن بر صوفی و ملا سلامے　　که پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت　　خدا و جبریل و مصطفٰےؐ را

میں عزیزانِ من! پوری دیانتداری سے عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں اسے شرک سمجھتا ہوں۔ جہاں تک متوارث نظریات کا تعلق ہے انہیں میں نے اس زمانے میں قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا تھا، جب میں قدامت پرستی کے ظلمت کدوں سے عقل و فکر کی وادیوں کی طرف آیا تھا۔ اور جہاں تک عصرِ حاضر کے پیدا کردہ نظریات کا تعلق ہے، ان میں سے ایک ایک کو میں نے ہدفِ تنقید بنایا اور قرآن کی روشنی میں پرکھا ہے۔ لہٰذا، میرے فہمِ قرآنی میں، کہیں غیر شعوری طور پر میرے خیالات کی آمیزش ہو گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن میں نے دانستہ کبھی ایسا نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے لئے مَیں اپنے آپ کو خدا کے ہاں جوابدہ سمجھتا ہوں۔ ذمہ داری کا یہی شدید احساس ہے جس سے میری کیفیت، یہ ہوتی ہے کہ میں قرآن کے متعلق جب بھی کچھ کہنے کے لئے لب کشائی کرتا، یا کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہوں، تو میرا دل لرز جاتا ہے، میری روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اب میں چند الفاظ خود قرآن کریم کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔

لفظ قرآن کا مفہوم

لفظ قرآن کا مادہ (ق - ر - ء) ہے۔ عربی زبان میں مادہ کسے کہتے ہیں اور اس کی خصوصیت کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر عرض کرونگا۔

اس مادہ (ق - ر - ء) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ــــ جمع کرنا اور محفوظ رکھنا ــــ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جمع" اور "حفظ" بھی تو عربی زبان کے الفاظ ہیں اور خود قرآن نے انہیں استعمال بھی کیا ہے تو پھر (ق - ر - ء) کے مادہ میں کیا خصوصیت ہے کہ قرآن کا لفظ، اس مادہ سے لیا گیا، جمع اور حفظ سے

نہیں۔ قرآن کا ایک اعجاز لفظوں کا انتخاب ہے، اور اس کا یہ انتخاب خود پکار کر کہہ دیتا ہے کہ؛ ع

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

(ق ــ ر ــ ء) کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اس طرح جمع اور محفوظ رکھنا جس طرح رحم میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رحم میں نطفہ اس طرح محفوظ نہیں رکھا جاتا جس طرح (مثلاً) کسی تھیلی میں چند سکے محفوظ رکھے ہوں۔ وہ سکے، جامد ہوں گے اور ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے۔ لیکن رحم میں نطفہ جامد نہیں ہوتا۔ اس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے، نشو و نما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم، تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک، ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے (اور ہے) کہ یہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلا جائے۔ یہ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ کاروانِ انسانیت کے لئے ہر منزل میں چراغِ راہ ہو۔ یہ کسی مقام پر بھی یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مقام اسی ضابطۂ ہدایت کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے مفہوم میں، علمِ انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی صلاحیت ہو۔ اس حقیقت کو میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ ــــــ جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی قرآن کی صداقت اور نکھر اور اُبھر کر سامنے آتی جائے گی۔ انسانی علم کی ہر تحقیق۔ سائنس کا ہر انکشاف قرآنی دعاوی کی شہادت بنتا چلا جائے گا۔ دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ؛ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ چونکہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس لئے وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝ (۳۸/۸۷ ـ ۸۸)۔ اس میں بیان کردہ حقائق، سب کے سب ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آجائیں گے۔ یہ کچھ وقت کے بعد بے نقاب ہوں گے۔

یہ ہے لفظ قرآن کی، مادہ کے اعتبار سے خصوصیت۔ بعض ماہرینِ لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے، اور اس کے معنی ہیں اعلانِ عام (PROCLAMATION) اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوں گے مملکتِ خداوندی کا اعلامیہ۔ وہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی کہ؛ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ تو اس کے معنی ہوں گے ــــــ اُٹھ۔ اور دنیا میں اس خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعلانِ عام کر دے جس نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ یعنی اس حقیقت کا اعلان کہ انسانوں کی ربوبیت (پرورش) انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔ یہ اس خدا کے نظام کی تحویل میں رہے گی جس نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی نشو و نما کا ذمہ لیا۔ یہ تھا قرآن کا سب سے پہلا اعلان۔

کیسا انقلاب آفریں ہے خدا کا یہ اعلان

کتاب

خدا نے قرآن کو کتاب بھی کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ک ـ ت ـ ب) ہے جس کے معنی حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔ اس اعتبار سے کتاب کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہوں گے۔

قوانینِ فطرت

اس مقام پر ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ دنیا میں قوانین (LAWS) دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہے۔ قوانینِ فطرت کے متعلق ہر صاحبِ علم (سائنٹسٹ) اعتراف کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ لیکن جہاں تک دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ہے، مغرب کے سیکولر نظام کی عمارت اس مفروضہ پر استوار ہوتی ہے کہ انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو خود وضع کریں۔ لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت انسانی معاشرہ کو فوز و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین کے بنیادی اصول اور مستقل اقدار بھی (قوانینِ فطرت کی طرح) خدا ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ یہ اصول و اقدار وحی کی رو سے ملتے ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب اللہ" کے دو حصے ہیں۔ ایک صحیفۂ فطرت، جو خارجی کائنات میں بکھرا پڑا ہے۔ اور دوسرا صحیفۂ وحی، جس کا محفوظ اور مکمل مجموعہ قرآنِ کریم ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے یہ دونوں قوانین خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں اور قوانینِ وحی کی پابندی سے وہ قوتیں انسانی ذات کی نشو و ارتقا اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطۂ قوانین سے بھی اعراض برتا جائے تو دین، مذہب میں تبدیل ہو کر خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ (دنیا میں ذلت و خواری) کا موجب بن جاتا ہے۔ اور اگر مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برتا جائے تو دنیا اس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کے شعلے آج تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ اس روشِ زندگی کو قرآن نے "کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ

کیا یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہیں اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہیں۔

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (۲/۸۵)

جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری اس کے حصے میں آئے گی اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔

تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تسخیرِ فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا، اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کتاب ہے

قرآنِ کریم کو کتاب کہنے سے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی مقصود تھا کہ یہ ایک کتاب ہے، اور جس طرح تم کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھاتے

ہو، اُسی طرح اسے بھی پڑھو اور اس سے مستفید ہو۔ آپ سوچئے کہ اگر آپ کو کوئی ایسی کتاب دیدی جائے، جس کی زبان سے آپ ناواقف ہوں تو آپ اس کتاب کو کبھی نہیں پڑھتے۔ حتیٰ کہ اگر اس کی زبان مشکل ہو تو بھی آپ اس کے دو چار صفحے پڑھ کر الگ رکھ دیتے ہیں، کہ اس کا معیار میری علمی سطح سے اونچا ہے۔ اگر اس کتاب کا پڑھنا آپ کے لئے ضروری ہے تو آپ اس کی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں جس سے وہ کتاب سمجھ میں آ جائے۔ آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ کتاب پڑھتے جائیں خواہ وہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے۔ لیکن اس میں ایک استثناء ہے۔ اور وہ ہے قرآن کریم۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کی زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو، اسے پڑھتے رہنا چاہیئے۔ اس سے "ثواب" حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جسے اس شدت اور کثرت سے پڑھا جاتا ہو، اور اس کے ساتھ ہی، دنیا کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں جسے بے سمجھے پڑھا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے۔ یا یوں کہئے کہ قرآن کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے۔ یہ ایک بڑی گہری سازش تھی جسے تقدیس کا لباس پہنا کر مزین بنا دیا گیا۔ یوں قرآن کتاب نہ رہا، جنتر منتر کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ کتاب اور جنتر منتر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے الفاظ سمجھ کر پڑھے جاتے ہیں اور جنتر منتر کے الفاظ بلا سمجھے دہرائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قرآن کے الفاظ کے تعویذ لکھے جانے لگے۔ اس کی آیات کے ورد ہونے لگے اور اس کا نام رکھا گیا "اعمالِ قرآنی" اور ایسا کرنے والا کہلانے لگا "عامل"۔ سوچئے کہ ہم اس کتاب کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھئے جب تک مسلمان قرآن کو کتاب نہیں سمجھتا وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

مدوّن کتاب

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے شروع میں یہ کہہ دیا تھا کہ قرآن ایک کتاب ہے۔ عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے ان میں لوہے کا کڑا پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی ——— قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں ایک مرتب اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا، جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۃ الطور میں ہے۔

وَالطُّوْرِ ۝ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ (۵۲/۱-۳)

یعنی قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا اور پھر ان منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کر دی جاتی تھی۔ عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اُسے (PARCHMENT) کی شکل میں قرطاس بنا لیتے۔ اسے رَقّ کہتے تھے۔ جن تحریروں کو زیادہ عرصہ کے لئے محفوظ رکھنا مقصود ہوتا، انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبینِ وحی کا تعلق ہے، سورۂ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد کاتبوں نے کی تھی۔ (۸۰/۱۵-۱۶) اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں (منتشر ٹھیکریوں، ہڈیوں اور پتوں) کی مدد سے حضرت ابوبکرؓ صدیق، یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی تھی، وضعی ہیں، جنہیں

قرآن کریم میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے اختراع کیا گیا۔

مکمل و محفوظ

اسی مرتب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۶/۱۱۵) اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ جس خدا نے اسے نازل کیا ہے وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

یعنی خدا نے اس کی تصریح فرما دی کہ یہ

(۱) قرآن کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہ کے زمانے میں موجود تھا۔

(۲) یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔

(۳) یہ قیامت تک کے لئے محفوظ رہے گا۔

زبانِ عربی

قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۔ (۲۶/۱۹۵) اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے۔ خود لفظ "عربی" کے معنی بھی فصیح اور واضح کے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ "مبین" کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ یہ کتاب واضح ہے اور غیر ذی عِوَجٍ ۔ (۳۹/۲۸) اس میں کوئی پیچ و خم نہیں، التباس نہیں ——— صاف، نکھری، سیدھی، واضح کتاب روشن، حتیٰ کہ قرآن کو نور بھی کہا گیا ہے۔ خود روشن اور دنیا کو روشنی عطا کرنے والی کتاب۔

یوں تو قرآن کی زبان عربی کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ خدا نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے، اس رسول کا پیغام اسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہؐ کے اوّلین مخاطب عرب تھے، اس لئے قرآن انہی کی زبان میں آیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیّت کا پروگرام کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہرین بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی! ڈاکٹر (BUCKE) نے اپنی کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں مشہور مستشرق (MAX MULER) کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں میں بنیادی تصورات (ROOT CONCEPTS) کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچتی تھی، عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس (۵۷۴۴) الفاظ موجود تھے۔ اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ یہ بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے، جو عام طور پر تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے جو اس مادے سے مختلف الجواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد (۲۵,۰۰۰) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنیں گے ان کی تعداد کس قدر ہو گی۔

یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا۔ چونکہ یہ زبان بڑی سائنٹفک واقع ہوئی ہے اس لئے اس کا سیکھنا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے نہ لگ جائیں اور اس طرح یہ خاص طبقے کی اجارہ داری نہ رہے۔ خود قرآن کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ:-

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ (۵۴/۱۷)

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے: كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ (۴۱/۳) یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کی آیات کو نکھار کر الگ الگ کر کے واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں ایک واضح ضابطۂ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) ہے۔ یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے، انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

تصریفِ آیات

قرآن کے نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ: اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹)۔ قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے لئے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے، یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ جیسا کہ آپ سن چکے ہیں قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اُس میں کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے، اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اُس باب کے تحت مربوط طور پر دے دی جاتی ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ وہ یوں سمجھئے جیسے تئیس سال میں عطا فرمودہ مختلف خطابات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے۔ تفصیل کسی اور جگہ ہے۔ استثناء کسی اور سورۃ میں۔ نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسے "تصریف آیات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۶/۱۰۵)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لئے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جائے۔ جیسے چھلکا اور مغز الگ ہو جاتے ہیں اور یوں بات نکھر اور اُبھر کر سامنے آ جائے۔ اس سے واضح ہے کہ، قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔

(۱) محاورۂ عرب۔ یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے اُن الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں جو مفہوم عرب لیتے تھے، اُس سے واقفیت۔ اور

(۲) قرآن پر اتنا عبور کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے، یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آ جائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

اور یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق میں نے پہلے لغات القرآن اور اب تبویب القرآن مرتب کیا ہے۔

یہ کچھ تو عزیزانِ من! میں نے اپنے متعلق کہا۔ آپ احباب جس التزام سے میرے درس میں شریک ہوتے رہتے اور جس جذب و انہماک سے اسے سنتے رہتے ہیں، وہ قرآنِ کریم کے ساتھ آپ کی والہانہ وابستگی کی دلیل ہے اور اس کے لئے آپ مستحقِ ہزار تبریک و تہنیت ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ بنیادی نکتہ جسے میں اکثر اپنے درس میں بیان کیا کرتا ہوں، اُسے آج پھر دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی تعلیم صرف نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ کر لینے کے لئے نہیں۔ اس کا صحیح مقام، قلبِ انسانی کی گہرائیاں ہیں۔ اس لئے کہ ذہنی سطح پر تیرنے والی تعلیم، ایک قسم کا فکری نشاط تو پیدا کر سکتی ہے، انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو، جب تک اس کی اقدار کے پیمانے نہ بدلیں، اس کی سیرت و کردار میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب اس طرح قلب و نگاہ مسلمان ہو جائے تو پھر، قرآن کے الفاظ میں، یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے یہ صلاحیت تھی کہ وہ اس جہانِ مستعار کو بدل کر، اس کی جگہ ایک نئی دنیا وجود میں لے آئے، اس میں آج بھی اس کی صلاحیت بدستور موجود ہے۔ اس لئے کہ قانونِ کائنات نہ کبھی پرانا ہوتا ہے نہ فرسودہ —— قرآن آج بھی یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے کہ ؎

گر زمینی، آسماں سازد ترا! آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا
خستہ باشی! استوارت می کند بختۂ شلِ کو ہسارت می کند
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمیں ؎

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ۔ (17/9)

—— یہاں حضرت علامہ نے کہا ہے کہ —— گر زمینی آسماں سازد ترا —— یہ حقیقت ہے کہ جب عرب کی ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارا کرنے والی قوم نے قرآن کو اپنا راہ نما بنایا تو چند ہی سال کے عرصہ میں وہ قیصر و کسریٰ کی سطوت و شوکت کی مالک بن گئی۔ لیکن جب اس نے اس کا دامن چھوڑ دیا تو وہ آسمان کی ان بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ گری۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت بلیغ طور پر بیان کیا ہے جب کہا کہ، وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا۔ (7/175) اے رسول: ان لوگوں کو اس (بدنصیب) شخص کا قصہ سناؤ جسے ہم نے اپنا ضابطۂ قوانین عطا کیا۔ اس نے کچھ عرصہ تک، تو اسے خضرِ راہ بنایا۔ فَانْسَلَخَ۔ لیکن اس کے بعد وہ اس میں سے اس طرح نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور اس پر اس کینچلی کا نشان تک بھی باقی نہیں رہتا۔ اس نے قرآن کو چھوڑا تو فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ۔ شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۔ اور وہ تباہ ہو گیا۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا۔ ہم تو چاہتے تھے کہ اسے اس قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا

دیتے۔ وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ۔ لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹ گیا۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (۷/۱۷۶) یعنی اس نے اقدارِ خداوندی کا اتباع کرنے کے بجائے اپنے پست جذبات کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس سے وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

علامہ اقبالؒ ملت کی اس حالت کو بصد تاسف ان عبرت آموز الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ :-

بینی آں یک عالمِ فرسودہ است   ملت اندر خاکِ او آسودہ است

رفت سوز سینۂ تاتار و کرد   یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد؟

اور اس کے بعد کہتے ہیں :-

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ طلب !   العجب۔ ثم العجب۔ ثم العجب!!

ہم اپنے اس ناقابلِ تصور زوال کے اسباب کی تحقیق کرنے کے لئے کمیٹیاں بٹھاتے اور کمیشن مقرر کرتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس کا سبب بالکل ظاہر ہے۔ اور وہ یہ کہ :-

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اور اس کے بعد وہ امت کو اس کا علاج بتاتے ہیں کہ :-

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ   در بغل داری کتابِ زندۂ

اس کتاب میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ : ؎

گر زمینی ! آسماں سازد ترا

اسی کتاب کی طرف دعوت میری زندگی کا مقصود و منتہیٰ ہے۔

آخر میں مَیں بصد عجز و نیاز، بحضورِ رب العزت سجدہ ریز اور سپاس گذار ہوں کہ اس نے مجھے اس کی توفیق عطا فرمائی کہ میں اُس کی اس کتابِ عظیم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکوں، اور پھر جو کچھ میں نے سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی پہنچا سکوں۔ جہاں تک اس پروگرام کے دوسرے حصے کا تعلق ہے میں بار دگر بدرگاہِ ایزد متعال سجدہ گذار ہوں کہ اس نے مجھے ایسے رفقاء عطا فرما دیئے جن کی وسعتِ ظرف، عالی حوصلگی، کشادہ نگہی، اور اس کے ساتھ مسلسل کوہ کنی اور خارہ شگافی نے اس مرحلہ کو آسان کر دیا۔ آپ جو میری قرآنی فکر کو اس طرح ساری دنیا میں پھیلا ہوا دیکھتے ہیں، یہ انہی کے جذبۂ عشق، ایثار بے لوث اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے ——— وہ کوششیں جن کے لئے انہیں نہ کسی ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی امید۔ صلہ و ستائش تو ایک طرف، انہوں نے قرآن کا دامن تھاما تو سب اپنے، بیگانے ہو گئے۔ اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں :-

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا   میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

لیکن انہیں اس تنہائی کا ملال تو ایک طرف، احساس تک نہیں۔ یہ، بلکہ، اس سے اور خوش ہیں کہ ان کی جنت میں جہنم کا شائبہ تک نہیں رہا۔ انہوں نے اس بازارِ مصر میں جنسِ یوسف کو خریدا ہے، اس بیع و شریٰ پر وہ فرحاں و شاداں ہی نہیں، رقصاں و نازاں ہیں اور انتہائی جذب و کیف کے عالم میں سازِ فطرت کی نشید جانفزا

کی ہم آہنگی میں پکار پکار کر کہتے ہیں کہ سے

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

میرے عزیز از جان رفیقو! مجھے آپ کی رفاقت پر ناز ہے۔ اور رفاقت بھی ایسی کہ سے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا!
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میری ایک ایک سانس میں آپ کے لئے ہزار ہزار دعائیں پنہاں مضمر ہیں۔ میں انہی دعا پرور دعاؤں کے ساتھ اپنے اس حاصلِ مراد کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں: سے

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ حیات از من!
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

والسلام

تبویب القرآن

(۱) وہ کتاب جس کی تیاری میں برسوں لگے اور جو صدیوں تک ترو تازہ رہے گی۔

(۲) اس میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں جن میں سے ہر عنوان کے تحت ان تمام آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن مجید میں اس موضوع کے متعلق کچھ آیا ہے۔

(۳) یہ کتاب بڑے سائز کے ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ عمدہ سفید کاغذ۔ اوفسٹ کی طباعت۔ بغرض سہولت تین مضبوط اور جاذبِ نگاہ جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ اور پورا سیٹ بکس میں محفوظ ہے۔

(۴) قیمت مکمل سیٹ ایک سو ساٹھ روپے محصول ڈاک چھ روپے

: ملنے کا پتہ :

(۱) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور۔ (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (۸۴/۶)

ہزار جانکاہ مشقتوں کے بعد ہی سہی لیکن انسان کو بالآخر اسی کی طرف آنا ہے

انسانیت کا آخری سہارا

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیّت کا آخری سہارا

چارہ این است کہ از عشق کشاد ے طلبیم
پیشِ اُو سجدہ گذاریم و مُرادے طلبیم

دس سال اُدھر کی بات ہے کہ پرویز صاحب نے، طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ دسمبر ۱۹۶۷ء میں پر اپنا خطاب پیش کیا تھا۔ اسے بے حد پسند کیا گیا تو ہم نے اسے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر دیا۔ یہ پمفلٹ ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا لیکن اس کی مانگ بدستور چلی آ رہی ہے۔ اس تقاضا کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا تازہ ایڈیشن (بادنیٰ تغیرِ لفظی) شائع کر دیا جائے سو وہ پیشِ خدمت ہے۔

خطاب

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم کسی ایک فرد (یا جوڑے) کی داستان نہیں۔ وہ درحقیقت نوعِ انسان کی سمٹائی ہوئی تاریخ ہے جسے نہایت جاذب و دلکش تمثیل کے پیرایہ میں، بصیرت افروز و حقیقت کشا انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تمثیل میں آدم اور اس کی رفیقہ، انسان (مرد اور عورت) کے نمائندے ہیں۔ ملائکہ فطرت کی قوتیں ہیں جنہیں مسخر کر لینے کی صلاحیت انسان کو ودیعت کر دی گئی ہے۔ اور ابلیس اس کی مفاد پرستی کے بیباک جذبات ہیں جو خود اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شیطان اور ابلیس ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔ شیطان، انسانی جذبات کی شعلہ مزاجی کا مظہر ہے۔ (کہ اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں) اور ابلیس اس افسردگی اور مایوسی کا ترجمان، جو ہر اشتعال کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ (ابلیس کے بنیادی معنی مایوس کے ہیں) منظر اس داستان کا وہ دَور ہے جس میں پہلے پہل انسانی آبادی کی نمود ہوئی تھی۔ اس دَور میں سامانِ زیست کی

عام فراوانی تھی اور تمام انسان (جتنے کچھ بھی وہ تھے) ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے۔ (وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ ۱۰/۱۹) ان میں کوئی تفریق و تقسیم نہیں تھی۔ کوئی باہمی مخاصمت اور منازعت نہیں تھی۔ کسی قسم کے جھگڑے اور قضیئے نہیں تھے۔ اس لئے کہ وہ لوگ ابھی "میری اور تیری" کی تمیز سے ناآشنا تھے۔ وہ ایک ایسی جنت کی زندگی تھی جس میں کیفیت یہ تھی کہ: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵) جس کا جہاں سے جی چاہتا، پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس وقت ارض ـــــ یعنی ذریعۂ پیداوار ـــــ کی حیثیت متاع کی تھی۔ (۲/۳۶) یعنی استعمال کی شے، جس سے ہر ضرورت مند فائدہ اٹھا سکے لیکن وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔ وہ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ تھی۔ (۴۱/۱۰) یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ (۱۷/۲۰) اُس وقت خدا کی بے مزد و معاوضہ عطا کردہ بخشائشوں پر نہ بند باندھے گئے تھے، نہ پھاٹک کھڑے کئے گئے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ اس میں ہر انسان کو اس کا اطمینان حاصل تھا کہ: إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۔ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اسے نہ بھوک کا خوف ستا سکتا تھا، نہ پیاس کا، نہ لباس کے متعلق کسی قسم کی پریشانی ہو سکتی تھی، نہ سکونت کے متعلق۔ اس زندگی میں انسان سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم سب ایک خاندان کے افراد ہو اس لئے تم ایک برادری بن کر رہنا۔ وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) آپس میں مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں ان چیزوں کا پھٹ کر الگ الگ ہو جانا جو اصل کے اعتبار سے (شجر کی طرح) ایک ہوں۔

ابلیس کا وسوسہ

آدم اس سکون و اطمینان اور اس وحدت و اشتراک کی زندگی بسر کر رہا تھا کہ ـــــ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ ۔ (۲۰/۱۲۰) اس کے دل میں انفرادی مفاد پرستی کے سرکش جذبات نے انگڑائی لی اور اس کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ تجھے دوسروں کی کیا پڑی ہے۔ تو اپنی اور اپنی اولاد کی پرورش کی فکر کر۔ اس وسوسۂ شیطانی اور افسونِ ابلیسی کا نتیجہ یہ تھا کہ آدم کی وہ وحدت اور برادرانہ اشتراک کی زندگی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ (۲۰/۱۲۳) یعنی باہمی عداوت اور معاندت کی کیفیت۔ ـــــ اَلْعِدَاءُ، اس لکڑی کو کہتے ہیں جو کسی لکڑی کو پھاڑ کر اس کے دونوں حصوں کے درمیان (WEDGE) کے طور پر دے دی جاتی ہے کہ وہ آپس میں مل نہ سکیں۔ اس اَلْعِدَاءُ سے، یہ برادری پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی، اور ایک خاندان دوسرے خاندان کا رقیب و حریف بن گیا۔ جب انفرادی طور پر خاندانوں نے اپنے مفادات کو غیر محفوظ پایا تو چند خاندانوں نے مل کر قبیلہ کی شکل اختیار کر لی۔ اب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے مدمقابل کھڑا ہو گیا۔ خود لفظ قبیلہ کے معنی ایک دوسرے کے مدمقابل کے ہیں۔ اس طرح انسان، اس قدیم زندگی کو چھوڑ کر، جسے عصرِ حاضر، زمانۂ قبل از تمدن سے تعبیر کرتا ہے، دورِ تہذیب و تمدن میں داخل ہوا۔ جوں جوں یہ اس تہذیبی دور میں آگے بڑھتا گیا، اس کی یہ گروہ بندیاں، شدت اختیار کرتی گئیں۔ تا آنکہ اس تقسیم نے قبائل کی جگہ، اقوام (NATIONS) کی شکل اختیار کر لی۔ اسے انسان کی تمدنی زندگی کی معراج قرار دیا جاتا ہے۔

اس تمثیل میں، فطرت کی قوتوں (ملائکہ) نے جب انسان کے انفرادی مفاد پرستی کے جذبہ اور اس سے پیدا شدہ

فساد انگیزیاں

"میری اور تیری" کی تفریق پر نگاہ ڈالی تو زبانِ حال سے کہا تھا کہ اس کے ہیولے میں یہ دبی ہوئی چنگاریاں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ: يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ (۲/۳۰) یہ زمین فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ چنانچہ اس اولین دور کے بعد، انسانیت کی ساری تاریخ (بجز چند لمحات کے) خون ریزیوں اور فساد انگیزیوں کا عبرت ناک مرقع اور جگر خراش داستان ہے۔ جس میں ایک فرد دوسرے فرد کے، ایک خاندان دوسرے خاندان کے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے، اور ایک قوم دوسری قوم کے سامنے، خنجر بدست (اور اس کے ساتھ ہی کفنی بدوش) کھڑی ہے۔ اور یہ سب کا ہے کے لئے؟ —— اَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبٰى مِنْ أُمَّةٍ۔ (۱۶/۹۲) تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ سلب و نہب —— (EXPLOITATION) کرسکے اور اس طرح اس پر بالادست ہو جائے۔ قوموں کی اس باہمی مسابقت سے انسانیت کس جہنم سے گذر رہی ہے، اس کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ مفاد پرستیاں ابھریں کیسے؟

زمین، ذریعہ پیداوار ہے، لیکن زمین کی کیفیت یہ ہے کہ —— وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ۔ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ۔ (۱۵/۲۱) —— اس میں رزق کے خزانے مدفون ہیں، لیکن وہ خزانے ایک خاص اندازے اور پیمانے کے مطابق ہی باہر آتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، زمین سے رزق حاصل کرنے کے لئے محنت درکار ہوتی ہے اور یہ رزق اس محنت کے تناسب سے حاصل ہوتا ہے —— جتنی زیادہ محنت، اتنا ہی زیادہ حصولِ رزق۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کی مشترکہ مفاد کی زندگی کی جگہ، انفرادی مفاد اندوزی نے لی تھی تو اس میں سب سے زیادہ خوشحال اسے ہونا چاہیئے تھا جو سب سے زیادہ محنت کرے —— لیکن ابلیس، یعنی انسان کی عقلِ فریب کار نے، جو اس کے جذبات کی تسکین کے لئے اسباب و ذرائع تجویز کرتی اور اس کے ہر اقدام کے لئے وجوہِ جواز —— (JUSTIFICATORY REASONS) تراشتی ہے، اس کے کان میں پھر افسوں پھونکا، اور اس سے کہا کہ میں تمہیں ایسی تدبیر بتاتی ہوں جس سے محنت دوسرے کریں اور تم آرام سے بیٹھے، سامانِ

فتنے کی بنیاد

زیست سمیٹتے جاؤ۔ اس کے لئے اس نے ذرائع رزق پر ملکیت کا تصور دیا۔ اس تصور سے ہوس پرست انسان کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ اس نے مختلف حیلہ جوئیوں، اور فریب انگیزیوں سے زمین پر لکیریں کھینچیں، اور ایک حصہ زمین کو اپنی ملکیت قرار دے کر دوسروں کو اس سے محروم کر دیا۔ جب ان محرومین کی ذریعہ رزق تک رسائی نہ رہی، تو وہ مجبور ہو گئے کہ وہ "مالکانِ اراضی" کی مرضی کے مطابق محنت کریں اور ان کی دی ہوئی روٹی کھائیں۔ اس سے دنیا میں بیگار، یعنی غلامی کی لعنت کی بنیاد پڑی۔ اگر ایسا ہوتا کہ یہ محنت کش غلام، جس قدر کھاتے، اس سے کم (یا اتنا ہی) پیدا کرتے تو یہ نظام زندہ نہ رہ سکتا۔ لیکن جتنا انہیں دیا جاتا تھا وہ اس سے زیادہ کما کر دیتے تھے۔ اس سے اس نظام کو استحکام حاصل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دن نوعِ انسان کی تاریخ میں سب سے زیادہ منحوس تھا جب ایک غلام نے اپنے مالک کو اس سے زیادہ کما کر دیا جتنا وہ کھاتا تھا۔ اس سے اس ابلیسی نظام کو

استواری نصیب ہوئی جس میں محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا حاصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ نوعِ انسان کی، خاندانوں قبیلوں اور قوموں کی تقسیم، تمدنی، اور سیاسی نوعیت کی تھی۔ لیکن اگر آپ بنظرِ تعمق دیکھیں تو یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آجائے گی کہ بنیادی طور پر انسان، دو ہی طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ ایک طبقہ محنت کرنے والا اور دوسرا طبقہ ان کی محنت کی کمائی پر بیٹھ آسائش زندگی بسر کرنے والا۔ اس طبقہ کو قرآن، مترفین کہہ کر پکارتا، اور نوعِ انسان کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے۔

دو گروہ

آپ تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ اسلوب و انداز مختلف ہوں گے، اسباب و ذرائع متباین ہوں گے، نقاب اور پیکر بھی متنوع ہوں گے۔ لیکن نوعِ انسان اصولی اور بنیادی طور پر انہی دو گروہوں میں منقسم دکھائی دے گی ——— ایک گروہ محنت کشوں کا۔ دوسرا گروہ ان کی محنت کے حاصل کو غصب کرنے والوں کا ——— اس نظامِ معیشت و تمدن کی رُو سے، اصول یہ طے پایا کہ محنت کش کو صرف اتنا دیا جائے جس سے وہ محنت کرکے کما کر دینے کے قابل رہے۔ اس سے زائد اس کے پاس کچھ نہ پہنچنے پائے۔ اور غاصبین کے پاس ان کی ضروریات سے فاضل دولت (SURPLUS MONEY) جمع ہوتی رہے۔ یہ فاضلہ دولت، تمام فسادات کی جڑ ہے۔ اسی سے یہ طبقہ اقتدار حاصل کرتا ہے، اور اس اقتدار کی رُو سے، محنت کشوں کو ان کی پست سطح پر رہنے پر مجبور کئے رکھتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ تاریخِ انسانیت میں زمامِ اقتدار کبھی محنت کشوں کے ہاتھ میں نہیں آنے پائی۔ یہ ہمیشہ غاصبین کے قبضہ میں رہی ہے۔ اس زمانہ میں جسے عصرِ حاضر، جہالت اور بربریت کا دور کہتا ہے، یہ اقتدار خالص طبیعی قوت (PHYSICAL FORCE) کے بل بوتے پر قائم رکھا جاتا تھا۔ دورِ تہذیب میں اس قوت کو قانون کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ جو قانون غاصبینِ محنت کا وضع اور نافذ کردہ ہوگا، وہ کس کے مفاد کا تحفظ

قانون بھی انہی کا آلۂ کار رہے

کرے گا؟ یہ قانون، چوروں، قزاقوں، رہزنوں کو مجرم قرار دے گا۔ (تاکہ ان غاصبین کی دولت محفوظ رہے۔ مزدور کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جسے کوئی چرا کر لے جائے گا؟) لیکن یہ قانون ان لوگوں کو کبھی مجرم قرار نہیں دیگا جو دوسروں کی کمائی کو دن رات لوٹتے رہتے ہیں۔ یہ جرائم کے انسداد کے لئے تدابیر اختیار کرے گا۔ لیکن جرائم کے محرکات اور اسباب و علل کو ختم کرنے کے لئے کچھ نہیں کرے گا ——— اس کے لئے کہ یہ محرکات و اسباب تو خود اس قانون ساز سرمایہ دار طبقہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں ——— اس نکتہ کی وضاحت اسلامی تاریخ کے اس واقعہ سے ہو سکے گی کہ ایک شخص کے ملازموں نے کسی کے کھیت سے غلّہ چرا کر کھایا تو حضرت عمرؓ نے انہیں سزا دینے کے بجائے، ان کے آقا کو سزا دی، کیونکہ وہ انہیں پیٹ بھر کر کھانے کے لئے نہیں دیتا تھا اور انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر غلّہ چرا کر کھایا تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اُن کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ مبنی تھا قرآن کے اس اصول پر، کہ اضطراری حالت میں، بھوک مٹانے کی حد تک، حرام کھانے کی بھی اجازت ہے۔ یہ تھا محرکاتِ جرائم کے انسداد کی طرف مؤثر اقدام ——— مستقل احتیاج، پیہم احساسِ عدمِ تحفظ (SENSE OF INSECURITY) طبقاتی تفاوت کے پیدا کردہ امتیازات سے معاشرہ کے خلاف

جذباتِ انتقام و نفرت۔ قدم قدم پر مجروح ہونے والی انسانی خودی کا تخلیق کردہ احساسِ کمتری۔ اپنی مرضی اور اختیار کے بغیر، غریبوں کے گھر میں جنم لینے کے گناہ، بلکہ یوں سمجھئے کہ دنیا میں آجانے کے جرم کی پاداش میں عمر بھر سزا بھگتنے کے احساس سے نظامِ عدل و انصاف کے خلاف جذباتِ بغاوت۔ احترامِ آدمیت کی تمام راہیں بند ہو جانے سے، خود زندگی سے بیزاری ——— یہ اور اسی قسم کے اور اسباب ہیں جو جرائم کے محرکات بنتے ہیں۔ دوسروں کی محنت کو غصب کرنے والا طبقہ، ان محرکات کو روکنے کی تدبیر کس طرح کرے گا اور کیوں کرے گا؟ ایسا کرنے کے لئے انہیں سب سے پہلے اس نظام کو ختم کرنا ہوگا جس میں محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے انہیں خود اپنے بامِ بلند سے نیچے اُتر کر سطحِ آدمیت پر آنا پڑے گا۔ اس کے لئے انہیں خود کما کر کھانا پڑے گا۔ اتنی ہی نہیں، بلکہ اپنی کمائی میں سے ان لوگوں کے لئے بھی دینا پڑے گا جو کسی وجہ سے کمانے کے قابل نہ رہیں۔ یہ لوگ ایسا کیوں کریں گے؟ ان کی تو انتہائی کوشش یہی رہے گی کہ اس نظام کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں جس میں محنت کش کو سر اٹھا کر چلنے کی جرأت ہی نہ ہو۔ لہٰذا ان لوگوں کے وضع کردہ قانون کی رو سے وحدت و مساواتِ انسانیہ کیسے پیدا ہو سکے گی؟ اور اس قسم کے قانون کے مطابق فیصلوں کو میزانِ انسانیت میں عدل کیسے قرار دیا جا سکے گا؟

لیکن ظاہر ہے کہ خالی دھاندلی اور دھونس سے، اپنے ہی جیسے انسانوں کے اس قدر گروہِ کثیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی گرفت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لئے کچھ اور حربوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پہلے "دانشوروں" کا گروہ آگے بڑھتا ہے اور عقلی دلائل سے ان زیردستوں کو مطمئن کرانے کی

فلسفہ کے دلائل

کوشش کرتا ہے کہ ان کے لئے وہی مقام مناسب اور عین مطابقِ فطرت ہے جس پر انہیں رکھا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور یونانی مفکر ارسطو کے ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز میں ستر دلیلیں دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ٹیڑھے پاؤں کے لئے ٹیڑھا جوتا ہی مناسب ہوتا ہے۔ اگر آپ اسے سیدھا جوتا پہنا دیں گے تو اس سے وہ دو قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ یہ کیا ہے؟ عقلِ فریب کار کی حیلہ تراشیاں جس سے وہ محض ایک غلط مثال (یا تشبیہ) سے پیدا کردہ تصور کو زندگی کی مستقل قدر بنا کر دکھا دیتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مختلف صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اس لئے معاشرہ میں ان کا مقام، ان کی صلاحیتوں کے مطابق متعین ہونا چاہیئے۔ اگر کم صلاحیت والے کو اونچا مقام دے دیا گیا تو وہ ٹیڑھے پاؤں کو سیدھا جوتا پہنا دینے کے مرادف ہوگا۔ یعنی ان غاصبین کا معاشرہ پہلے ایسا انتظام کرتا ہے جس سے زیردست طبقہ کی صلاحیتیں اُبھرنے ہی نہ پائیں۔ اور اس کے بعد، اس اختلافِ صلاحیت کو طبقاتی تقسیم کے لئے بطور دلیل پیش کر دیتا ہے۔ علم و حکمت کے ان اجارہ داروں سے کوئی پوچھے کہ اگر پیدائشی صلاحیتیں عمر بھر اپنی سطح پر جامد رہتی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو بلال حبشی رضؓ، صہیب رومی رضؓ، زید رضؓ اور ان کے بیٹے اسامہ (رضؓ) اور ان جیسے صدہا اور غلام، مزدور، محنت کش، جنہیں اس زمانے کے معاشرہ نے ہر قسم کی صلاحیتوں سے عاری اور ذلیل ترین مخلوق قرار دے رکھا تھا، چند دنوں کی صحیح تعلیم و تربیت سے کس طرح انسانی صلاحیتوں کے بلند ترین مظہر بن گئے تھے؟ اگر

فطرت۔ غلام کو پیدا ہی خدمت گذاری کے لئے کرتی ہے تو دنیا میں غلاموں نے سلطنتیں کس طرح قائم کر دکھائی تھیں؟

پھر بھی حکمتِ الطبیعی ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ مختلف قسم کے کام کرنے والوں کی ضروریات بھی مختلف ہوتی ہیں اس لئے ہر ایک کو یکساں نہیں ملنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات اس کی طبیعی زندگی کے تقاضے پورے کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک انجنیئر کی طبیعی زندگی کے تقاضے، ایک مزدور کی زندگی سے مختلف ہوتے ہیں جو ان کیلئے سامانِ پرورش میں تفاوت بھی ناگزیر ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ہر فرد کے ذمے جو کام لگایا جائے گا، اس کام کے سرانجام دینے کے لئے مختلف آلات و ادوات کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ ان کی طبیعی ضروریات میں بھی فرق ہوگا۔ اگر ایک مزدور کو چائے کے ساتھ انڈے اور مکھن دے دیئے جائیں تو کیا اُن سے اس کے پیٹ میں درد اُٹھنے لگ جائے گا؟ اور اگر اس کے گھر میں بھی صوفہ سیٹ رکھ دیا جائے تو کیا اُسے اس پر بیٹھنے سے سوئیاں چُبھیں گی؟ قرآن کریم نے جنت کے متعلق کہیں یہ نہیں کہا کہ اس میں کچھ لوگوں کو کھانے کو گوشت، پھل، دودھ، شہد۔ بیٹھنے کو صوفے اور قالین اور پہننے کو حریر و اطلس ملیں گے اور دوسرے لوگوں کو دال روٹی دی جائے گی، جسے وہ مچھیں کی جھونپڑی میں زمین پر بیٹھ کر کھائیں گے۔ وہاں اس قسم کی کوئی تفریق نہیں بتائی گئی۔ یہ جہنمی معاشرہ کا اسلوب و انداز ہے جس میں انسان اور انسان کی طبیعی ضروریات میں اس قدر تفاوت روا رکھا جاتا ہے۔ اور کام کی اُجرت، اس تفاوت کے پیشِ نظر متعین کی جاتی ہے۔ اسے (LIVING WAGE) کہا جاتا ہے۔

اُجرتوں کا تعیّن

یہ اُجرتوں کا تعین بھی، عزیزانِ من! عجیب گورکھ دھندا ہے۔ مزدور کی اُجرت تین روپے روز ہوگی اور انجنیئر کی تیس روپے یومیہ۔ سوال یہ ہے کہ اس تین روپے اور تیس روپے یومیہ اُجرت مقرر کرنے کا معیار اور اصول کیا ہے؟ یہ معیار طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا سوال ہے۔ اور کیا؟ کارخانہ دار کو ایک ہزار مزدور اور ایک انجنیئر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ طریقِ انتظام ایسا کرتا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی مزدوروں کے سوا کچھ اور نہ بن سکے۔ لہٰذا، اس جنس کی رسد (SUPPLY) طلب (DEMAND) سے زیادہ ہوتی ہے۔ بنابریں مزدور کے لئے اس بات کے فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جو اُجرت اسے پیش کی جاتی ہے وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ وہ اس قدر ضرورت مند ہوتا ہے کہ اسے جو اُجرت بھی میسر آ جائے، اسے غنیمت سمجھتا اور آجر کا شکر گذار ہوتا ہے کہ اس نے اسے رزق مہیا کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ بڑی بڑی صنعتوں والے، ملک کے سر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اس قدر کثیر آبادی کے لئے رزق فراہم کرنے کا انتظام کرتے ہیں۔ یہ ہیں عقلِ فسوں ساز کے وہ حیلے جن سے وہ نوعِ انسان کی اس تقسیم و تفریق کی جڑیں مضبوط کئے رکھتی ہے۔

اسی عقلِ فسوں ساز نے انسان کو ایک اور مغالطہ بھی دے رکھا ہے اور یہ وہ مغالطہ ہے جسے آغازِ تاریخ سے اس وقت تک، مشرق و مغرب میں ہر جگہ، ایک مسلّمہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ انسان

کی فطرت ہی ایسی واقعہ ہوئی ہے کہ ذاتی ملکیت اور زیادہ سے زیادہ انفرادی نفع اندوزی کے سوا کوئی جذبہ محرکہ نہیں جو اسے زیادہ سے زیادہ کام پر آمادہ کر سکے۔ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا اگر اس نکتہ پر تفصیلی بحث کروں کہ انسان کی سرے سے کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت تو مجبور اشیاء کی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ جیسے آگ کی فطرت حرارت پہنچانا ہے ۔۔۔۔ اور انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ کی فطرت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا اور اپنے لئے آپ راہیں تراشتا ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح تصور کر لیا جائے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جس کام میں اسے ذاتی نفع نہ ہو، وہ اس کے لئے کوشش نہیں کرتا، تو آپ ایک حقیقت پر غور کیجئے۔ ہم تاریخِ انسانیت میں ان افراد کی تعریف کرتے ہیں، ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں، ان کے مجسمے نصب کرتے ہیں، انہیں نوعِ انسان کا محسن قرار دیتے ہیں، جنہوں نے اپنے نفع کی خاطر نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر عمریں صرف کر دیں۔ بلکہ جانیں تک دے دیں! ۔۔۔۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ، جو تاریخِ انسانیت کے ممتاز ترین مقام پر فائز ہیں، کیا یہ سب خلافِ فطرت زندگی بسر کرتے تھے؟ اگر انسان کی فطرت کوئی چیز ہے (جسے فطرت نہیں بلکہ شرفِ انسانیت کہنا چاہیئے) تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی ذات کے لئے نہیں، عالمگیر انسانیت کے لئے جیئے۔ صرف اپنے اور اپنی اولاد کے لئے جینا، حیوانی سطح زندگی ہے۔ دوسروں کے لئے جینے والا، انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ حیوان صرف اپنے لئے جیتا ہے، انسان دوسروں کے لئے بھی جیتا ہے۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ دوسرے انسانوں پر اپنی گرفت محکم رکھنے کے لئے انسانی عقل نے عجیب و غریب دلائل تراشے ہیں اور زبردست طبقہ کو قسم قسم کے حربوں سے اپنے دامِ تزویر میں پھنسائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن، عزیزانِ من! عقل کی گرفت انسان کے دماغ پر ہوتی ہے، دل پر نہیں۔ اور دماغ پر گرفت کے ڈھیلا پڑ جانے کا ہر وقت خطرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسانیت کُش نظام، تنہا عقل کے زور پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اس کے لئے انسانی جذبات کو اپنے قابو میں رکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ خدمت "مذہب" سرانجام دیتا ہے۔ (یاد رکھئے! میری مراد خدا کی طرف سے عطا کردہ دین سے نہیں، انسانوں کے خود ساختہ مذہب سے ہے۔)

اربابِ مذہب کی فریب دہی

مذہب، کبھی اس زیردست طبقہ کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کرتا ہے کہ ہر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ جنم کے اعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ اس اصول کے مطابق، برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتا ہے کھشتری اس کے بازوؤں سے، ویش اس کے پیٹ کی اور شودر اس کے پاؤں کی تخلیق ہوتا ہے۔ یہ تقسیم خود برہما کی قائم کردہ ہے جس میں کوئی انسان ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ اس تقسیم کے خلاف حرفِ شکایت لب تک لانا تو ایک طرف، دل میں شکوہ سنج ہونا بھی انسان کو مہاپاپی بنا دیتا ہے۔ اس لئے انسان کو اپنے مقام پر صابر و شاکر رہنا چاہیئے۔ کبھی وہ اس مظلوم و مقہور طبقہ کو اس فریب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ دنیا اور اس کی آسائشیں وہ دلدل ہیں، جس میں پھنس کر انسانی روح کبھی خدا سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے

یہ تمام لذائذ و حظائظ قابلِ نفرت ہیں۔ درویشت منش لوگ اس دنیا کی چند روزہ زندگی، آسائشوں میں گذار لیں۔ اس کے بعد، یہ جہنم کی آگ میں جھلسا دیئے جائیں گے اور آسمان کی بادشاہت غریبوں کے حصے میں آئے گی۔ کبھی وہ انہیں اس عقیدہ میں مگن رکھتے ہیں کہ امیری اور غریبی، عزت اور ذلت، پستی اور بلندی، رزق کی تنگی اور فراوانی، سب خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اسے ہر شخص کی پیدائش سے پہلے مقدر کر دیا جاتا ہے۔ مقدر کا بدل دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہیئے۔ مرضیٔ مولیٰ ہمہ اولیٰ۔ اس لئے تقدیر کے خلاف کسی کے لب پر حرفِ شکایت نہیں آنا چاہیئے۔ آپ غور کیجئے تو تقدیر کا عقیدہ ہندوؤں کے ورنوں کے عقیدہ سے بھی زیادہ غیر منطقی ہے۔ ورنوں کا عقیدہ خود ساختہ ہی سہی، لیکن اس کے لئے ایک منطقی دلیل تو دی جاتی ہے۔ یعنی اس میں شودر سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم جو اس پستی کی حالت میں پیدا کئے گئے ہو، تو یہ ایشور کی دھاندلی نہیں۔ تم نے پچھلے جنم میں کرم ہی ایسے کئے تھے جن کے نتیجہ میں تم شودر پیدا ہوئے ہو۔ لیکن تقدیر کے لئے اتنی سی دلیل بھی نہیں دی جاتی، نہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے۔ وہ جسے جس حالت میں چاہے رکھے۔ غریبی اور امیری، رزق کی تنگ و کشاد، پستی اور بلندی، سب اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے (معاذ اللہ) نہ کوئی قاعدہ ہے، نہ قانون۔ وہ بیکسر اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس کے فیصلوں کے خلاف لب کشائی کرنا انسان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ یعنی اس میں انسانی سوچ اور فکر کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہنے دی جاتی —— یہ ہیں مکڑی کے وہ جالے جن میں مذہبی پیشوائیت، مذہب انسانوں کو پھنسائے رکھتی ہے۔

وہ یہ کرتے ہیں اور سرمایہ دار طبقہ ان کے لئے جاگیریں مقرر کرتا اور جائیدادیں وقف کر دیتا ہے۔ چنانچہ، محنت کرکے نہ یہ کھاتے ہیں اور نہ ہی ان کا سرپرست طبقہ —— ! جھونپڑیوں میں بسنے والا محنت کش اپنا خون پسینہ ایک کرکے ان سب کے حالات کی رنگینیوں کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہی کی محنت کی کمائی سے سرمایہ دار کے پاس فاضلہ دولت کے انبار لگ جاتے ہیں، اور مذہب کا مقدس اجارہ دار آگے بڑھ کر یہ فتویٰ دے دیتا ہے کہ تم گھبراؤ نہیں۔ جس قدر جی چاہے دولت اکٹھی کرتے، اور جائدادیں کھڑی کرتے جاؤ۔ تمہیں ایسا کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ وہ اس قسم کے فتوؤں سے بالادست طبقہ کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ دولت خدا کی دین ہے۔ وہ جس قدر جی چاہے سمیٹتے چلے جائیں۔ گویا دولت آسمان سے اولوں کی طرح برستی ہے جسے بچے جھولیاں بھر بھر کر سمیٹ سکتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ دولت، محنت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک روپیہ جسے مترفین کا طبقہ بلامحنت اپنی تجوری میں ڈالتا ہے، مزدور کے سینکڑوں قطراتِ خون کا منجمد نچوڑ ہوتا ہے۔ کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ یہ لوگ جانوروں کے خون کو تو حرام سمجھتے ہیں، لیکن انسانوں کے خون کو شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب قرار دیتے ہیں۔

یہاں تک میں نے، برادرانِ عزیز! تقسیمِ آدم کے اس حصے سے بحث کی ہے جو ایک قوم کے اندر وجہِ فسادِ آدمیت بنتا ہے۔ اب ہم قوم کی حدود سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر آتے ہیں۔ اس سطح پر اجمالی طور

اقوامِ غالب کی حیثیت

یہ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ جو کچھ بالا دست طبقہ، زیر دست طبقہ کے ساتھ ایک معاشرہ کے اندر کرتا ہے، وہی کچھ ایک بالا دست قوم، زیر دست قوموں کے ساتھ کرتی ہے۔ ہمارے زمانے میں، بالا دست قومیں صنعت میں ترقی یافتہ ہوتی ہیں، اس لئے انہیں ایک طرف ایسی قوموں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں خام مال سپلائی کریں اور دوسری طرف ان منڈیوں کی جہاں ان کا تیار کردہ مال فروخت ہو۔ اس مقصد کے لئے ان اقوام نے شروع میں، ان پسماندہ اقوام پر اپنا سیاسی تسلط براہِ راست قائم کیا اور ان کے گھروں میں پہنچ کر چھاؤنیاں ڈال دیں۔ یہ دور استعماریت (COLONISATION) کا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے، ان پسماندہ اقوام کی عادات اس قدر بگاڑ دیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ان اقوامِ غالب کی تیار کردہ مصنوعات کی محتاج ہو گئیں — تہذیب کی فریب کارانہ زبان میں یوں کہا جائے گا کہ انہوں نے اِن کا "معیارِ زیست بلند کر دیا"۔— دوسری طرف انہیں اس قدر اپاہج بنا دیا کہ وہ اب، وہ کچھ بھی اپنے ہاں تیار نہ کر سکیں جو کچھ وہ اس سے پہلے اپنے ہاتھوں سے تیار کر لیا کرتی تھیں۔ ان قوموں کو اس حالت تک پہنچا کر وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلی گئیں، اور میکیاولی سیاست کی زبان میں کہا گیا — کہ انہوں نے آزادی عطا کر دی ہے اور یہ، اِن اقوام ہی پر نہیں، عالمِ انسانیت پر ان کا احسانِ عظیم ہے۔ چونکہ ان میں کوئی قوم برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ان کی منڈیوں میں کوئی دوسری قوم دخیل ہو سکے، اس لئے انہوں نے اِن منڈیوں کے اِرد گرد اپنے فوجی اڈے مستحکم کر لئے اور زیر دست اقوام سے کہا کہ اس سے اُن کی حفاظت مقصود ہے۔ اس کے بعد اِن اقوامِ غالب نے، پسماندہ اقوام کو مزید "مہذب" بنانے کے لئے، ان کے ہاں اپنی بڑی بڑی مشینیں نصب کر دیں۔ یہ مشینیں دی تو گئیں قرض پر لیکن تعبیر کیا گیا اسے "امداد" سے۔ ان مشینوں میں جو کچھ تیار ہوتا ہے، ان کے کیمیاوی اجزا (CHEMICALS) سب اُنہی اقوامِ غالب کے ہاں سے منگوانے پڑتے ہیں۔ نیز، اگر ان مشینوں کا ایک پیچ بھی ٹوٹ جائے تو جب تک وہ ان کے سرچشمہ، ملک سے نہ آئے، مشین بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اِس پروگرام کی رُو سے اِن اقوام کو سمجھایا گیا کہ وہ صنعتی ترقی کر رہی ہیں۔

پھر ان اقوامِ غالب نے بساطِ سیاست پر ایسے مہرے رکھے کہ یہ پست اقوام اپنی ہمسایہ اقوام سے ہمیشہ خائف رہیں اور اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے اسلحہ کی محتاج۔ یہ اسلحہ اِنہی اقوامِ غالب کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ یہ قومیں ان پسماندہ اقوام کو، بلا لحاظ اس امر کے کہ ان میں سے کس کی ضرورت جائز ہے، اس طرح اسلحہ فراہم کرتی ہیں کہ ان میں سے کبھی ایک کا پلڑا جھک جائے، کبھی دوسری کا اور اس طرح ان میں قوت کا عدم توازن جاری رہے۔ اس طرح اِن اقوام کی آمدنی کا بیشتر حصہ، اسلحہ کی خرید کی نذر ہو جاتا ہے اور انہیں روٹی تک بھی مانگ کر کھانی پڑتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان قوموں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ؎

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر

فسادِ آدمیت کے لئے یہی حربے کچھ کم نہ تھے کہ انسانوں میں بُعد و مغائرت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے، عقلِ انسانی کی دسیسہ کاری نے، سِکّہ (CURRENCY) کو بھی اپنا آلۂ کار بنایا۔ زمانہ قدیم میں زندگی

سکّہ کی دسیسہ کاریاں

کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بارٹر سسٹم (تبادلۂ اشیاء) کا رواج تھا۔ میرے پاس گندم ضرورت سے زائد ہے، آپ کے پاس شکر۔ میں نے آپ کو گندم دے دی اور اپنی ضرورت کے لئے شکر لے لی۔ اس سے ایک تو ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں اور دوسرے، دولت کسی ایک جگہ جمع نہیں ہونے پاتی تھی ——— فالتو جنس کا زیادہ ڈھیر جمع کر کے انسان کیا کرتا اور اسے کب تک محفوظ رکھ سکتا! جب آبادیاں وسیع ہوئیں تو انسان نے تبادلۂ اشیاء کی سہولت کی غرض سے سکّہ ایجاد کیا۔ یہ بڑی مفید ایجاد تھی۔ لیکن جس طرح انسان کی ہوس پرستی نے دوسری مفید ایجادات کے غلط استعمال سے ان کی افادیت کو تباہی سے بدل دیا، یہی کچھ سکّے کے ساتھ ہوا۔ اس سے جہاں تک افراد کا تعلق ہے، دولت کا بے حد و حساب اکتناز شروع ہو گیا اور جہاں تک اقوام کا تعلق ہے، غالب اقوام نے تبادلۂ زر کے عیارانہ الٹ پھیر سے سکوں کی قیمتوں میں کچھ اس طرح کا تفاوت رکھا کہ پسماندہ اقوام کا روپیہ وہاں پہنچ کر چار آنہ رہ جائے۔ جہاں تک انسان اور انسان میں بُعد و مغائرت کا تعلق ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ لندن کے بھرے بازار میں کھڑے ہوں اور ایک ہزار پاکستانی روپیہ آپ کی جیب میں ہو لیکن آپ وہاں سے ایک آنہ کی روٹی خرید کر نہیں کھا سکتے۔ وہاں آپ بھی اجنبی ہیں، آپ کی کرنسی بھی اجنبی۔ کچھ سمجھے آپ؟ آپ انسانوں کی بھری بستی میں، تنہا ہیں۔ آپ خود اپنی جنس کے اندر کھڑے غیر ہیں۔ بیگانہ ہیں، اجنبی ہیں۔ آپ اس زمین کے رہنے والے نہیں، کسی آسمانی کرّے سے ٹپک پڑے ہیں۔ اور اس زمین کے رہنے والوں سے آپ کا کوئی رشتہ ناطہ، کوئی تعلق واسطہ، کوئی رابطہ ضابطہ نہیں۔ رنگ، نسل، وطن، زبان کا فرق تو پہلے ہی تھا۔ اب اس سکّے نے اس فہرست میں ایک اور کا اضافہ کر دیا ——— اور سخت اضافہ ——— کس قدر صحیح نقشہ کھینچا تھا اس ابلیسی معاشرہ کا قرآن نے جب کہا تھا کہ اس میں انسان کی کیفیت یہ ہو گی کہ:-

يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ (۹۰/۱۵)

وہ دوسرے انسانوں کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا پائے گا۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ مقام، جس پہ انسانیت اس وقت کھڑی ہے۔ اس سے یہ کرۂ ارض انسانوں کی بستی نہیں رہا، ایک مذبح بن چکا ہے جس میں جسدِ انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرا پڑا ہے۔ اور وہی نوعِ انسان جو کبھی ایک برادری تھی، اس کی کیفیت یہ ہے کہ:-

يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ (۸۰/۳۴-۳۶)

بھائی بھائی سے الگ ہے، بیٹا ماں باپ سے جدا، میاں بیوی سے اور بیوی میاں سے بیگانہ۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔ (۸۰/۳۷)

ہر ایک اپنی اپنی ہپتا میں اس طرح مبتلا کہ ایک کو دوسرے کا ہوش تک نہیں۔ ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
قیامت ہے کہ انساں، نوعِ انساں کا شکاری کا

اقوامِ عالم کی باہمی آویزش

قومیتوں کی اس تفریق سے پیدا شدہ نفسا نفسی اور افتراق سے انسان کی حالت، کیا ہو چکی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود ان اقوام سے پوچھئے جو ابھی کل تک نیشنلزم کو خدا کی رحمت قرار دیا کرتی تھیں۔ سنیئے کہ اب انہی اقوام کے مفکرین اس عفریت کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر، الفریڈ کوبن، اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے:۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے، تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حقِ خود مختاری مانگتی ہوں۔
> (صفحہ - ۱۶۶)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD) میں لکھتا ہے:۔

> ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم، نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

ہمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ ہی کی نہیں رہی۔ اس نے ایک مذہبی عقیدہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آلڈس ہکسلے کے الفاظ میں:۔

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح اور وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔
> (THE PERENNIAL PHILOSOPHY)

اس نیشنلزم نے انسان اور انسان میں کس حد تک مغائرت پیدا کر رکھی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس وقت امریکہ کا شمار دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ پسماندہ ممالک کے لئے اس کی "امداد" نے (جس کی نقاب کشائی میں ابھی ابھی کر چکا ہوں) ساری دنیا میں اس کے جذبۂ ہمدردیٔ نوعِ انسان کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ لیکن یہ اس امریکہ کی بات ہے جو اس خطۂ زمین کے شمال میں واقعہ ہے۔ اسی امریکہ سے ایک قدم کے فاصلے پر جنوبی امریکہ ہے۔ اس کی حالت کیا ہے، اس کا اندازہ ان چند اعداد و شمار سے

۱۔ یہ خطاب ۱۹۶۷ء میں لکھا گیا تھا۔

لگایا جا سکتا ہے جنہیں (FELIX GREEN) نے اپنی کتاب (A CURTAIN-OF IGNORANCE) میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

لاطینی امریکہ کی بیس کروڑ آبادی کا دسواں حصہ بھی ایسا نہیں ہوگا جسے پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو۔ ریو ڈی جنیرو، بیونس آئرس اور میکسیکو جیسے چند شہروں کو چھوڑ کر باقی علاقہ کی حالت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے، غلاظت کے ڈھیروں پر پڑے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کے ماں باپ بیس سینٹ روزانہ کی اُجرت پر دن بھر محنت و مشقت کرتے ہیں۔

خود اس ملک کے اندر طبقاتی تفریق کا یہ عالم ہے کہ ملک کی کل آمدنی کا آدھا حصہ چلی کی آبادی کے دسویں حصہ کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے اور نصف آمدنی باقی نوّے فی صد آبادی کے حصہ میں آتی ہے۔ فلپائن کی یہ حالت ہے کہ وہاں کی آبادی کے قریب ۸۶ فی صد حصہ کو بمشکل ایک وقت کا کھانا نصیب ہوتا ہے اور وہاں کے بچوں کی بیس سے چالیس فی صد تعداد، ایک سال کے اندر اندر مر جاتی ہے۔ یہ ہے اس امریکہ کے ہمسایہ ممالک کی حالت جس کی کشادہ ظرفی اور بنی نوعِ انسان کے لئے جذبۂ خیر سگالی کا ڈھنڈورا اس شد و مد سے پیٹا جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا، عزیزانِ من! کہ وہ حجۃ قرآن کریم نے کہا تھا کہ اگر تم نے اشتراکِ باہمی کی زندگی کو چھوڑا تو تم ایک دوسرے کے دشمن بن جاؤ گے اور تم میں (WEDGES) حائل ہو جائیں گی وہ کیسی بنیادی حقیقت تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس سے حالت یہ ہو گئی ہے کہ:-

زیر گردوں آدم، آدم را خورد
ملتے بر ملتے دیگر چرد

انسان کی اپنی حالت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک قوائے فطرت کی تسخیر کا تعلق ہے، دنیا جس مقام پر گذشتہ پچاس سال میں پہنچ گئی ہے، اس سے پہلے کہ چھ ہزار سال کی مجموعی ترقی اس کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن علم و ہنر کی اس قدر ثریا بوس رفعت اور حدود فراموش وسعت کے باوجود، انسانوں کی اس عظیم بستی کی کیا حالت ہے جسے زمین کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ماہرِ علم النفس، ڈاکٹر ینگ (JUNG) کا ایک فقرہ دہرا دینا کافی ہوگا جو اس نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا تھا۔ اس نے کہا تھا:-

آج کرۂ ارض کی عظیم شاہراہوں پر ہر شے ویران، اداس، اور فرسودہ نظر آتی ہے۔

یہ بات اس نے ۱۹۳۱ء میں کہی تھی۔ اگر ینگ آج زندہ ہوتا تو ان شاہراہوں کی موجودہ ویرانیوں کو دیکھ کر نہ معلوم کیا کہتا۔ وہی کچھ کہتا جو چند سال اُدھر، امریکہ کے دو صحافیوں نے اپنے ملک کی تمدنی اور معاشرتی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا، وہ ان کی کتاب کا ٹائیٹل پکار پکار کر کہہ

رہا تھا۔ کتاب بھی اہلِ امریکہ کے متعلق اور اس کا ٹائیٹل تھا۔

(THE LONELY CROWD)

برادرانِ عزیز! کیا انسانی معاشرہ کی اس سے زیادہ عبرت انگیز تصویر کوئی اور بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسا ہجوم ہے جس میں ہر فرد اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اور پھر انسان کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن اس جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ:-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار　　عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس وقت دنیا کا حساس طبقہ اپنی موجودہ حالت کی وجہ سے سخت مضطرب و بے قرار ہے۔ وہ ہزار جان سے چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ دنیا ایک اور دنیا میں بدل جائے۔ اس دنیا کا کس قسم کا نقشہ اس کے ذہن (یا یوں کہئے کہ اُن کے

انسان کس قسم کی دنیا چاہتا ہے؟

خوابوں) میں آتا ہے، اس کے متعلق خود انہی کے الفاظ میں سنیئے۔ کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری — [TEILHARD - DE - CHARDIN) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب "تعمیرِ ارض" (BUILDING THE EARTH) میں لکھتا ہے:-

اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کریں اور مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر (خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے اچھال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے وحدت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر، پوری نوعِ انسان کو اپنے آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب (THE COMMUNITY OF MAN) میں لکھتا ہے کہ:-

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اُسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہمدگر جوڑے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

مشہور امریکی مفکر (LEWIS MUMFORD) لکھتا ہے کہ "تہذیب درحقیقت اس عملِ پیہم اور مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا اور ایک انسانی برادری کی تشکیل کرے۔" وہ آگے چل کر کہتا ہے:-

اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مغربی اندازِ معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدن بُری طرح ناکام ثابت ہوا ہے..... اب دنیا کو ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اُس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح اس کی نشو و نما کے راستے میں بُری طرح حائل ہو رہی ہیں ——— اس بطلِ جلیل کی ضرورت جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر، وحدتِ انسانیت کے عالم گیر نظام کی طرف لے جائے۔

(TRANSFORMATION OF MAN)

جولین ہکسلے کہتا ہے کہ دنیا کی موجودہ مختلف حکومتوں کی جگہ ایک عالم گیر واحد حکومت کا قیام، نوعِ انسان کو تباہی سے بچا سکتا ہے کہ۔ اس عالمگیر وحدتِ انسانیہ اور وحدتِ نظامِ حکومت کے تحت جو نئی دنیا وجود میں آئے گی وہ کس قسم کی ہوگی، اس کا نقشہ سویڈن کا ماہر معاشیات (GUNNER MYRDAL) ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان، ہر مقام پر، خود اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے کام اور اندازِ زیست کا انتخاب کرے گا۔ اور اس میں معاوضہ اس محنت کا ملے گا جس سے کچھ تخلیق ہو، اور یہ معاوضہ نسل اور کلچر کی تمیز کے بغیر سب کے لئے یکساں ہوگا۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں سرمایہ اور محنت، انسانی ضرورتوں کے مطابق اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہوتا رہے گا۔ اور اس میں دنیا کے تمام ممالک اور تمام افراد کو ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ جب تک دنیا کی یہ حالت رہے گی کہ اس کی نصف آبادی دولت مند اور باقی نصف مفلس ہے، کوئی عالم گیر معاشی نظام وجود میں نہیں آ سکے گا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ صاحب سویڈن کے ماہرِ معاشیات ہیں۔ اور سویڈن وہ ملک ہے جہاں کی فلاحی مملکت، دنیا میں سب سے آگے سمجھی جاتی ہے۔ اس فلاحی مملکت کے ماہرِ معاشیات نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے (BEYOND THE WELFARE STATE) یعنی اس ماہرِ معاشیات کے نزدیک، فلاحی مملکت بھی نوعِ انسان کے اس بنیادی مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حل، اس سے کہیں آگے جا کر ملے گا۔ آگے چل کر یہ مصنف لکھتا ہے:

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آ جائے جس میں نہ کرۂ ارض کے نقشے پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں، اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے

(ON LIVING IN A REVOLUTION.) ۵۱

مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی۔ اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

"انسانی روح کے مذہبی نشیمن" میں اس قسم کی حسین دنیا کا تصور تو اب عام طور پر کیا جانے لگا ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ حسین خواب محسوس تعبیر کا پیکر کس طرح اختیار کرے۔ جہاں تک مختلف مذاہب کا تعلق ہے، دنیا اُن سے مایوس ہو چکی ہے۔ کس حد تک مایوس، اس کے متعلق پروفیسر ——— (WILLIAM ERNST HOCKING) اپنی کتاب ——— (LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH) میں لکھتا ہے:۔

یہ تمام مذاہب ٹوٹی پھوٹی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے)۔ یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے۔) ان کے متہیین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر نہیں آ سکتی) ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے (افکار و عمل کے) قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں کے تصور سے اس قدر ڈرے اور سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

مذہب کیسا ہو؟

دنیا کا انسان ان مذاہب سے مایوس ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی مشکلات کے حل کے لئے دروازہ پھر مذہب ہی کا کھٹکھٹاتا ہے لیکن کس قسم کے مذہب کا؟ لارڈ مارلے کے الفاظ میں، اس مذہب کا جس کی دعوت تمام نوعِ انسان کے لئے ہو۔

(ERICH FROMM) کا خیال ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی، کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔ (THE SANE SOCIETY)

ممفورڈ کا خیال ہے کہ اس قسم کا مذہب (حضرت) عیسےٰؑ اور (حضرت) محمدؐ جیسی شخصیتیں دے سکتی

ہیں۔ وہ شخصیتیں کہ زمانے کا بحران ان کی تخلیقی نگاہ کو ایک عظیم انقلاب سے ہم آہنگ کر دے اور وہ اس قابل ہوں کہ تاریخِ انسانی کا رُخ بدل دیں اور دنیا میں ایک عالمگیر انقلاب برپا کر دیں۔

(THE TRANSFORMATION OF MAN)

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ عصرِ حاضر کا خود گزیدہ انسان، اپنے دکھ درد کے مداوا کے لئے کس مقام پر پہنچا ہے اور اس کی نگہِ تجسس اسے کس چشمۂ زندگی کا سراغ دے رہی ہے۔ نوعِ انسان کی موجودہ مرگ آفریں زندگی کو حیاتِ نو میں بدلنے والا انقلاب یقیناً (حضرت) عیسیٰ اور (حضرت) محمدؐ جیسی ہستیاں ہی برپا کر سکتی ہیں۔ لیکن دنیا میں اس وقت نہ تو خود (حضرت) عیسیٰ موجود ہیں اور نہ ہی حضرت محمدؐ۔ اس لئے انسان کو لامحالہ ان کے دیئے ہوئے پیغام ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جہاں تک حضرت عیسیٰ کا تعلق ہے، ان کا لایا ہوا پیغام اس وقت اپنی اصلی شکل میں دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ اور جس پیغام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس سے انسان پہلے ہی مایوس ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق (مثلاً) جرمن مصنف اور مفکر (GERHARD SZCZESNY) لکھتا ہے:—

> عیسائیت صحرا نوردوں کا مذہب ہو سکتی ہے۔ بنیادی طور پر اس کا پیغام ثنویت (DUALISM) کی تعلیم دیتا ہے۔ جو فلسفہ اور سائنس کا ساتھ دے ہی نہیں سکتی۔ دو ہزار سال سے اس نے علم اور سائنس کی گاڑی کو جکڑ رکھا ہے۔
>
> (THE FUTURE OF UNBELIEF)

پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:—

> عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں، بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ یہ دنیا محض مجبوری حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقی دنیا بعد کی دنیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ دنیا شر اور فساد کی دنیا ہے۔ اس میں کوئی شے بالکل خیر اور طیب نہیں۔[1]

مشہور مفکر پروفیسر وائٹ ہیڈ لکھتا ہے:—

> انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اگر اسے موجودہ زمانے میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔[2]

اس تجزیہ کے بعد ہمارے سامنے عزیزانِ من! صرف (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لایا ہوا پیغام رہ جاتا ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم

---

1. (GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)
2. (ADVENTURE OF IDEAS.)

نے دیکھنا یہ ہے کہ جس وحدتِ انسانیت کے لئے اس وقت دنیا کے مفکرین اس قدر مضطرب و بے قرار ہیں اور انسانی معاشرہ کا جو نقشہ وہ اپنے خوابوں میں دیکھ رہے ہیں، نبی اکرمؐ کا لایا ہوا پیغام، ان کی ان حسین آرزوؤں کو پورا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے یا نہیں۔ اور اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کے حصول و قیام کے لئے کوئی ممکن العمل پروگرام بھی دیتا ہے یا یونہی نظری تصورات ہی پیش کر دیتا ہے۔ یہ مقام خاص توجہ کا مستحق ہے۔ میں اس سلسلہ میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پیغام کو میں اس لئے پیش نہیں کر رہا کہ میں خود اس کی صداقت اور حکمیت کا قائل ہوں۔ میں اسے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ (جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا) حالات کے تجزیہ نے ہمیں خود اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں ہمیں اس پیغام پر غور و فکر کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ یہ میری پیشکش نہیں، دنیا کے مفکرین کا بیتابانہ مطالبہ ہے جسے پورا کرنے کے لئے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ اسے بے کم و کاست، اور بلا تبصرہ و تقریظ ان کے سامنے پیش کر دوں اور یہ فیصلہ ان پر چھوڑ دوں کہ اس پیغام میں دنیا کی مشکلات کا حل موجود ہے یا نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

قرآن کا پیش کردہ نظام

قرآنِ کریم نے قصۂ آدم کے سلسلہ میں جہاں کہا تھا کہ تم نے جو انفرادی مفاد پرستی کی زندگی اختیار کی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں پھوٹ پڑ جائے گی اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہو جاؤ گے۔ تو اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا انسان کی یہ حالت ابدی ہوگی؟ ——— کیا وہ اس نفسا نفسی کی قیامت خیزیوں اور تشتت و انتشار کے جہنم سے کبھی نہیں نکل سکے گا؟ عیسائیت نے ہبوطِ آدم کے اس تصور سے یہی عقیدہ وضع کیا تھا کہ انسان اس پستی سے اپنی سعی و کاوش سے نکل ہی نہیں سکے گا۔ وہ ابدی طور پر راندۂ درگاہ ہو گیا۔ لیکن قرآن نے کہا کہ نہیں۔ ایسا نہیں ——— ابدی مایوسی شرفِ انسانیت کے منافی ہے۔ انسان پھر سے اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پا سکتا ہے۔ اس کے لئے خود خدا اس کی مدد کرے گا۔ اور وہ اس طرح کہ اسے اس کی طرف سے راہ نمائی ملے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) جو کوئی اس راہ نمائی کا اتباع کرے گا تو اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ یہ راہ نمائی رسولوں کے ذریعے بھیجی گئی۔ رسولوں کی بعثت سے مقصود کیا تھا؟ وہ غور سے سننے کے ——— قرآنِ کریم اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ——— كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً۔ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ۔ (۲/۲۱۳) چونکہ مقصود یہ تھا کہ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری بن کر رہے اس لئے خدا نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ وہ لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر انہوں نے انفرادی مفاد پرستی کی روش کو نہ چھوڑا تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ اور اگر وہ ایک برادری کی حیثیت سے رہے، تو وہ خوشگواریوں کے جھولے جھولیں گے۔ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ کتاب بھی بھیجے جاتے رہے تاکہ ان کی رو سے ان امور کے حق و انصاف کے ساتھ فیصلے کئے جا سکیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے ان میں گروہ بندیاں

پیدا ہو جاتی ہیں۔ تمام انبیاء کرامؑ کی دعوت یہی تھی اور سب کا مقصود و منتہیٰ یہی۔ لیکن عہدِ قدیم میں چونکہ وسائلِ رسل و رسائل اور سامانِ مواصلات بہت محدود ہوتے تھے اس لئے ان حضرات کی دعوت ان کے علاقوں کے اندر ہی محدود ہو کر رہ جاتی تھی اور تمام نوعِ انسان کو امتِ واحدہ بنانے کا پروگرام عالمگیر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے حیطۂ اثر کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو، خاندان، قبیلہ، نسل کے امتیازات سے بلند کر کے، خالص انسانیت کی بنیادوں پر ایک مشترک برادری کی تشکیل کرتے تھے جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیتے وہ ایک برادری کے افراد بن جاتے تھے۔ جو اس کی مخالفت کرتے، طبقاتی تفریق کی گروہوں کو مستحکم رکھنا چاہتے تھے وہ فریقِ مخالف قرار پاتے تھے۔ یہی بنیادی طور پر کفر اور اسلام کا امتیاز تھا۔ قرآن کریم، اس فریقِ مخالف کو مترفین یعنی سرمایہ داروں کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے جن کی تائید و حمایت مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، سردارانِ قوم اور مذہبی پیشواؤں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فرعون، ہامان اور قارون ایک ہی حقیقی کے چچے بھائی ہیں ——— آسمانی رشد و ہدایت کی ساری تاریخ انہی دو گروہوں کے باہمی تصادم و تزاحم کی داستان ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تا آنکہ جب انسانیت کے سنِ بلوغ کو پہنچنے کا زمانہ آ گیا تو خدا کی طرف سے آخری نبی آیا۔ اور اپنے ساتھ وہ ضابطۂ ہدایت لایا جس میں اس مقصد کے حصول کا مکمل پروگرام دیا گیا تھا۔ اس رسولؐ نے آ کر اعلان کیا کہ :——— يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (۷/۱۵۸) اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغامبر ہوں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس خطاب میں کس طرح انسانوں کی خود ساختہ حدود و قیود سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ کچھ اپنے متعلق کہا اور اپنے پیغام کے متعلق اعلان کیا کہ :——— يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ۔ (۱۰/۵۷) اے ساری دنیا میں بسنے والے انسانو! تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ ہدایت آ گیا ہے جو تمہارے نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہوسِ زر پرستی ایک نفسیاتی مرض ہے، اسی لئے قرآن کو اس مرض کے لئے نسخۂ شفا کہا گیا ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر کہا :——— يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ۔ (۴/۱۷۰) اے نوعِ انسان! تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے، تمہارے پاس الحق (THE TRUTH) آ گیا۔ اب تمہیں انسانوں کے خود ساختہ فریب انگیز نظاموں کی پیروی چھوڑ دینی چاہیئے عالمگیر انسانیت کے نام اس رسولؐ کا پیغام یہ تھا کہ :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ

رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ (۲/۲۱-۲۲)

اے نسلِ انسانی! تمہیں چاہیئے کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس خدا کے قوانین کی جس نے تمہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کو پیدا کیا اور کائنات کی اس قدر تخریبی قوتوں کے علی الرغم نسلِ انسانی کو مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے اس مقام تک لے آیا۔ بس یہی طریق ہے جس سے تم راستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

یہ حفاظت تمہیں، خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی رو سے مل سکے گی جس کے مطابق اس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا۔ اوپر فضا میں کُرّے بکھیر دئے۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے۔ اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے۔ تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ جانتے بوجھتے، خدا کے ساتھ اور ہمسر کھڑا کر دینے کے مرادف ہوگا۔

اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (۲/۱۶۸)

اے نوعِ انسان! تم رزق کے سرچشموں کو تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھو اور اس میں سے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق نہایت خوشگوار طریق سے کھاؤ پیو۔ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کر کے، انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے نہ لگ جاؤ۔ وہ تمہارا دوست نہیں، دشمن ہے۔

آپ نے عزیزانِ من! اس آیۂ جلیلہ کے الفاظ پر غور فرمایا؟ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ جو کچھ زمین سے حاصل ہو، اگر وہ تمام نوعِ انسان کے لئے سامانِ زیست بنتا ہے تو اسے رزقِ حلال و طیب کہا جائے گا۔ اور اگر اس کی یہ شکل نہیں رہے گی تو پھر یہ شیطانی رزق ہو جائے گا۔ اس پیغام کے دینے والے خدا نے قرآنِ کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنا تعارف ربّ العالمین کہہ کر کرایا (۱/۱) یعنی کسی خاص قوم، نسل، گروہ، خاندان، قبیلہ کا نشو و نما دینے والا نہیں، بلکہ عالمگیر انسانیت کو نشو و نما دینے والا۔ اس ابتدائی تعارف کے بعد، سارا قرآنِ کریم خدا کی اسی ربوبیتِ عالمینی اور انسانیت ساز تعلیم کی تشریح ہے۔ اس لئے خود قرآن کو ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ کہا ہے۔ (۸۱/٦) اور اس کے لانے والے رسولؐ کو رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (۲۱/۱۰۷)

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی تعلیم کس طرح انسانوں کی خود ساختہ گروہ بندیوں کی زنجیروں کو توڑ کر عالمگیر انسانیت کو اپنے آغوشِ عاطفت میں لاتی ہے، اور ان انسانوں کو، جنہیں مفاد پرستیوں کی ہوسِ خون آشامی

وحدتِ انسانیت

نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، پھر سے ایک عالمگیر برادری میں منسلک کرنے کی طرف عملی دعوت دیتی ہے۔ اس لئے کہا ہے کہ عدالتِ خداوندی میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جن کی روش یہ ہے کہ ــــ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ۔ (۲/۲۷) جنہیں ملانے کا خدا نے حکم دیا تھا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔ اور یوں انسانوں کی اس بستی کو فساد انگیزیوں کی رزم گاہ بنا دیتے ہیں۔ یہ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے لئے زندگی کی آسائشیں سمیٹ لیتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۱۳/۲۵) یہ لوگ اپنے آپ کو زندگی کی حقیقی سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم کرتے ہیں۔ انجام کار ان کا ٹھکانہ بہت بُرا ہوگا۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یاد رکھو! وہی نظریۂ حیات، وہی نظامِ زندگی، وہی عمل اپنے اندر باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو خاندان، قبیلہ، گروہ، نسل، قوم، وطن کی حدود سے آگے بڑھ کر تمام نوعِ انسان کے نفع بخش ہوگا۔

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

قرآنِ کریم، عزیزانِ من! خالی وعظ نہیں کہتا۔ نہ ہی خدا کا رسول محض ایک ڈاکیہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کا پیغام پہنچا کر چلا جاتا ہے۔ قرآن جس نصب العین کو پیش کرتا ہے اس کے حصول کا عملی پروگرام بھی دیتا ہے۔ اور اس کا رسول، اس پروگرام پر عمل کر کے، یہ بتا اور دکھا دیتا ہے کہ یہ پروگرام نہ تو ناممکن العمل ہے اور نہ ہی اپنی کامیابی کے لئے کسی مافوق الفطرت ایجنسی کا محتاج۔ انسانوں کے لئے یہ پروگرام ہے۔ اور انسانوں کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس پروگرام کو بروئے کار لاتے وقت قدم قدم پر اعلان کرتا جاتا ہے کہ: اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک جماعت کی تشکیل کرتا ہے جس کی خصوصیات یہ بتاتا ہے کہ: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اس جماعت کو نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے متشکل کیا جا رہا ہے۔ یہ جماعت عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے وجود میں آئی ہے۔ اس میں رنگ، نسل، قومیت، وطن کی تمیز و تفریق کے بغیر، ہر وہ انسان شامل ہو سکتا ہے جو وحدتِ خالق کے ایمان کی بنا پر وحدتِ خلق کے مسلک کا پیرو ہونا چاہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وحدتِ انسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، انفرادی مفاد پرستی کا سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اس لئے اس نظام کو مٹا کر، اس کی جگہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کا نفاذ اس جماعت کا فریضہ قرار پاتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، جہاں کہا ہے کہ ــــ وَلَوْلَآ اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِھِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّۃٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْھَا یَظْھَرُوْنَ۔ وَلِبُیُوْتِھِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْھَا یَتَّکِئُوْنَ۔ وَزُخْرُفًا۔ وَاِنْ کُلُّ ذٰلِکَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ وَالْاٰخِرَۃُ عِنْدَ رَبِّکَ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ (۴۳/۳۳-۳۵) اگر یہ مقصودِ فطرت یہ نہ ہوتا کہ تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بننا ہے تو ہم ان لوگوں کو جو ہمارے نظامِ ربوبیت عالمینی سے انکار کر کے سب کچھ اپنے

لئے سمیٹ لینا چاہتے ہیں، ایسا بے لگام چھوڑ دیتے کہ وہ اتنی دولت جمع کر لیتے جس سے ان کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں تک چاندی کی ہو جائیں اور ان کے گھروں کے دروازے اور کرسیاں سونے کی ۔۔۔ لیکن طبقات میں اس تفاوت سے نوعِ انسان ایک برادری نہ بن سکتی۔ اس لئے ہم ایسی جماعتیں پیدا کرتے رہتے ہیں جو دولت کی اس غلط تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں اور اس حقیقت کو عام کرتی ہیں کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصد صرف انسی زندگی کی آسائش و آرائش نہیں، اس کی مستقبل کی زندگی کی فلاح و بہبود بھی ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے تابع رہے۔ نظامِ سرمایہ داری کے تحت یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سے واضح ہے کہ نوعِ انسان کی عالمگیر وحدت کے لئے نظامِ ربوبیت کا قیام لابدی ہے۔ لیکن یہ نظام تشکیل نہیں ہو سکتا جب تک ذرائع رزق اس نظام کے کنٹرول میں نہ ہوں۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے اس جماعت کی اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں قوانین سازی کا اختیار کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو نہیں ہوتا۔ لہٰذا، اس میں اس کا امکان نہیں ہوتا کہ کوئی گروہ اپنی مفاد پرستی کے لئے، اپنی مرضی سے قانون بنا لے ——— ان قوانین کے اصول و حدود، خدا کے مقرر کردہ اور غیر متبدل ہوتے ہیں جن کا اطلاق تمام انسانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہی اصول، غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے معیارِ مطلق (ABSOLUTE STANDARD) ہوتے ہیں ——— ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ مفکرینِ عالم، وحدتِ انسانیت کے لئے وحدتِ حکومت کا قیام، بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے واحد حکومت کس طرح عمل میں آ سکتی ہے۔ اس کا طریق قرآن بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وحدتِ حکومت کے لئے وحدتِ قانون ناگزیر شرط ہے۔ یعنی ایسے ضابطہ، قوانین کا وجود جس کا اطلاق تمام نوعِ انسان پر یکساں ہو۔ اس قسم کا ضابطہ انسانوں کا وضع کردہ ہو نہیں سکتا۔ انسان جو قانون بھی مرتب کرے گا، اس میں اس کے رجحانات قلبی اور میلاناتِ ذہنی کی آمیزش ضرور ہوگی۔ اس قسم کی رنگ آمیزی سے بالا صرف خدا کا وضع کردہ ضابطہ قوانین ہو سکتا ہے جو انسانی جذبات و عواطف سے بالا ہے، اور تمام نوعِ انسان کی نشوونما جس کے پیشِ نظر ہے۔ یہ نظام، وحدتِ قانون کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے اور مختلف اقوام و ممالک کی خودساختہ لکیروں کو مٹاتا ہوا ایک عالمگیر اُمت کی تشکیل کئے جاتا ہے۔ وہ اصول و اقدار جن کی بنیادوں پر یہ نظام استوار ہوتا ہے، ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں۔ لیکن ہر زمانے کے انسانوں کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنی ضروریات کے مطابق جزئی قوانین خود وضع کریں۔ اس سے نہ تو انسان ایسا سرکش اور بے لگام ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے من مانے قوانین بنا بنا کر دوسروں کو اپنا محکوم بناتا چلا جائے اور نہ ہی ایسا پابہ زنجیر کہ زمانہ کہیں سے کہیں چلا جائے اور وہ قدامت پرستی اور تقلید کے بندھنوں میں جکڑا رہے۔ یہ اصول و قوانین عقل و فکر کے تقاضوں کی تسکین کرتے ہیں اور انہیں علم و بصیرت کی رو سے پیش کیا جاتا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا اس اُمت کا اولین

فریضہ ہوتا ہے لیکن وہ تسخیرِ فطرت، تخریبِ آدم کے لئے نہیں کرتی، انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے کرتی ہے۔ احترامِ آدمیت اس کا مطمحِ نگاہ ہوتا ہے اور "آدم" میں چونکہ مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں، اس لئے اس نظام میں، جنس (SEX) کی بنا پر انسان اور انسان میں فرق نہیں ہوتا۔ اس میں مرد اور عورت، دوش بدوش آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی انسان، نہ دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے، نہ محکوم ——— اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!

یہ نظام: نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے متعلق مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کرے گا۔ ان میں مرکزی حیثیت اس اجتماع کو ہو گی جسے حج سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کعبہ جس کا

کعبہ اور حج کی حیثیت

کا مرکز ہے۔ کعبہ اور حج کے متعلق قرآن کا پیش کردہ تصور بڑا غور طلب ہے۔ کعبہ، اینٹ اور پتھر کی اس عمارت کا نام نہیں جو مکہ میں ایستادہ ہے۔ جس طرح آج ہم (مثلاً) جب "ماسکو" کہتے ہیں تو اس سے ایک خاص شہر مراد نہیں ہوتا بلکہ یہ لفظ نمائندگی کرتا ہے اس نظام کی جو روس میں نافذ ہے۔ اسی طرح کعبہ، درحقیقت ترجمانی کرتا ہے، اس نظام کی جو نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ دیکھئے، قرآن کریم، اس نکتہ کی وضاحت کیسے دلنشیں الفاظ سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایسے مراکز تو موجود تھے جو کسی خاص قوم، خاص قبیلہ یا خاص مذہب سے نسبت رکھتے تھے۔ لیکن ایسا کوئی مرکز نہیں تھا جسے خالص انسانیت کا مرکز کہا جا سکے۔ اس قسم کا مرکز کعبہ کو بنایا گیا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا۔ (۳/۹۶) یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں پہلا گھر، جسے انسان کا گھر کہا جا سکے، مکہ میں بنایا گیا جو بڑا ہی بابرکت ہے۔ اس گھر کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ: مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۳/۹۷) جو بھی اس میں داخل ہو گیا ——— یعنی اس نظام کے سایۂ حفاظت میں آ گیا جس کا مرکز وہ گھر ہے وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ لہٰذا، کعبہ نوعِ انسانی کی پناہ گاہ ہے۔ وہ دنیا بھر کے ستائے ہوئے انسان کے لئے امن کا نشیمن ہے۔ دوسری جگہ ہے: وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔ (۲/۱۲۵) اس گھر کو اس لئے بنایا گیا ہے کہ تمام انسان، اپنے اختلافات ختم کر کے، ایک مرکز پر جمع ہو سکیں۔ اور اس طرح آلام روزگار سے امن و سلامتی حاصل کر لیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ (۵/۹۷) کعبہ کو واجب الاحترام مرکز اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس نظام کی رو سے جس کا یہ مرکز ہے، عالمگیر انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے۔ اسی لئے اسے "شہرِ آزاد" (OPEN CITY) قرار دیا گیا ہے۔ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ (۲۲/۲۵) اسے وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے یکساں کھلا رکھا گیا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ نبی اکرمؐ

کا ارشاد ہے کہ مکہ کے مکانات کرایہ پر نہیں دیئے جا سکتے۔ اس مرکزی مقام میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں شرکت کی دعوت تمام نوعِ انسان کے لئے عام ہے۔ چنانچہ معمارِ حرم، حضرت ابراہیمؑ جب تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے تو ان سے کہا گیا کہ: وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ (۲۲/۲۷) تمام نوعِ انسان کو حج کے لئے پکار کر دعوت دے دو۔ اور انسانوں سے کہا گیا کہ ــــ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا۔ (۳/۹۷) ــــ جو بھی وہاں تک پہنچنے کی راہ پائیں وہ اس اجتماع میں شریک ہوں۔ لیکن وہ اس اجتماع میں شرکت، اس لئے نہ کریں کہ وہاں جا کر کمزور قوموں پر ظلم و زیادتی کی اسکیمیں سوچی جائیں گی، یا لوگوں سے قوانینِ خداوندی کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کرائی جائے گی۔ جن لوگوں کی یہ ذہنیت اور نیت ہوگی، وہ ان اجتماعات میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ (۲۲/۲۵) مشرکہ، ہونا تو ایک طرف، انہیں تو اس کے پاس تک پھٹکنے نہیں دیا جائے گا۔ (۹/۲۸ ز ۹/۳) عالمگیر انسانیت کو ان اجتماعات میں شرکت کی دعوت اس لئے دی جائے گی کہ: لِیَشْہَدُوْا مَنَافِعَ لَہُمْ۔ (۲۲/۲۸) تاکہ وہ وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کے فائدے کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

یہ ہے سلیمانِ من! وہ نظام جسے قرآن، وحدتِ انسانیت کے لئے تجویز کرتا ہے۔ اس نظام کو وہ حق کا نظام کہتا ہے، اور اس کے برعکس ہر وہ نظام جو انسانیت میں تفریق کا موجب بنتا ہے اس کے نزدیک باطل کا نظام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ٹکراؤ کمیونزم کے فلسفۂ

حق و باطل کی کش مکش

تاریخ کا ٹکراؤ نہیں جس میں کبھی ایک نظام غالب آ جاتا ہے اور کبھی اس کے برعکس دوسرا نظام۔ حق و باطل کے ٹکراؤ میں، حق آہستہ آہستہ باطل پر غالب آتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی جماعت وجود میں آ جاتی ہے جو حق کی علمبردار بن کر رزم گاہِ حیات میں باطل کے مقابل کھڑی ہو جاتی ہے، تو حق کا غلبہ دونوں کے اندر رہ جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ حق کائناتی قوتوں کی رُو سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسے ہماری اصطلاح میں "زمانے کے تقاضے" کہتے ہیں۔ لیکن اس طرح حق کے غالب آنے کی رفتار بڑی سُست ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، خدا کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب انسان وحی کی راہ نمائی میں جادہ پیما ہوتا ہے تو اس کا سفرِ حیات، دنوں میں طے ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کا اتباع نہیں کرتا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی ایک راستہ اختیار کرتا ہے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ راستہ غلط ہے۔ پھر وہ دوسری راہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح وہ عقل کے تجرباتی طریق (TRIAL AND ERROR) سے، مختلف راستوں کی ٹھوکریں کھاتا، ایک عرصۂ دراز کے بعد، صحیح منزل پر پہنچتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے، اپنے رفقاء کی جماعت کے ساتھ، وحی

کی روشنی میں اس راستہ کو اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظام، چند دنوں میں قائم ہو گیا۔ اور ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح دیکھتے دیکھتے، مختلف ملکوں، نسلوں، قوموں کے افراد ایک ایسی برادری کے رشتے میں منسلک ہو گئے جس میں تفریق و تقسیم کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، مفاد پرست قوتوں نے پھر سر ابھارا اور اس نظام کی جگہ پھر اُسی نظام کہن نے لے لی جس میں انسان اور انسان میں بعد و مغائرت پیدا ہو گئی ——— خود مسلمانوں کے اندر مذہبی فرقوں کی تفریق، جسے قرآن نے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا تھا، نسلوں کی تفریق، ذات پات کی تفریق، امیر و غریب کی تفریق، ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق، حاکم اور محکوم کی تفریق، آجر اور مستاجر کی تفریق، بندہ اور آقا کی تفریق۔ اور یہی نظام مسلمانوں میں آج تک چلا آ رہا ہے۔ یاد رکھیئے۔ یہ نظام غیر قرآنی ہے۔ اسے اسلام کے سابقہ دور کا بھی واسطہ نہیں ——— یہ مذہب ہے، دین نہیں۔

لیکن اگر یہ نظام مسلمانوں کے ہاں باقی نہیں رہا تو اس سے عالمِ انسانیت کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نظام کے اصول اور اسے متشکل کرنے کا پروگرام قرآن کے اندر موجود اور محفوظ ہے اور جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقوق کسی خاص قوم کے حق میں محفوظ نہیں، اسی طرح قرآن پر بھی کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں۔ یہ ذکرٌ للعالمین ہے، بصائر للناس ہے۔ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے کھلا ہوا صحیفہ ہے۔

جس کا جی چاہے اسے اپنا لے

جس کا جی چاہے اسے اپنا لے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ اس وقت، مسلمانوں کے مقابلہ میں، مغربی ممالک کی غیر مسلم اقوام میں اسے اپنانے کے رجحانات زیادہ ہیں۔ مسلمان اپنے مروّجہ نظام کو جو صدیوں سے پیہم چلا آ رہا ہے۔ حق کا نظام سمجھ کر ایک گہرے فریب میں مبتلا ہے ——— جس قوم پر بھی مذہبی پیشوائیت کا غلبہ ہو گا اس کی یہی حالت ہو گی ——— لیکن اقوامِ مغرب اپنے ہاں کے مروجہ نظامہائے حیات سے بُری طرح تنگ آ چکی ہیں۔ اور (جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں) وہ ایک ایسے نظام کی تلاش میں مضطرب و بیتاب نظر آتی ہیں جو وحدتِ انسانیت کا ضامن بن سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام، قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔ اس لئے خود زمانے کے تقاضے انسان کو اس طرف لا رہے ہیں۔ اس کی نشاندہی بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہوئی ہے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا، وحدتِ انسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ دیکھئے۔ قرآن کریم اس آنے والے دور کی نشاندہی کرتا ہوا، اس ضمن میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۔ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۔ (۸۳/۱-۳) ۔ یاد رکھو! تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اس ذہنیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں سے اپنے واجبات پورے پورے لئے جائیں۔ لیکن جب ان کے واجبات دینے کا وقت آئے تو ترازو میں ڈنڈی مار دی جائے۔ دوسروں سے کام پورا پورا لیا جائے لیکن اس کام کا معاوضہ کبھی پورا نہ دیا جائے۔ محنت کرنے والوں کو کم از کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے۔ چیزوں ہی کو

نہیں، بلکہ خود انسانوں کو نوچنے اور ماپنے وقت بھی یہی خیال غالب رہے اور کوشش کی جائے، کہ ان کی صلاحیتیں دبی، سمٹی، سکڑی اور بندھی رہ جائیں۔ انہیں اتنا ہی ابھرنے دیا جائے جتنی وہ سرمایہ داروں کے منافع کے لئے مفید ہوں۔ انہیں اس سے زیادہ آزادی دی ہی نہ جائے۔ اس کے بعد کہا۔ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ۔ (۸۳/۴) کیا ان لوگوں کو اس کا خیال نہیں آتا کہ یہ نظام ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ وہ وقت آئے گا جب انہیں انسانیت کے راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۸۳/۵-۶) یہ اس انقلابِ عظیم کے وقت ہوگا جب انسانیت خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس قدر کی بہت سی نشانیاں قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ: اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ (۸۱/۴) جب اونٹ جیسا مفید جانور، تیز رفتار ذرائع سفر کی ایجاد سے بیکار ہو کر رہ جائے گا۔ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ۔ (۸۱/۵) جب پسماندہ اور وحشی اقوام میں بھی اجتماعی زندگی کا احساس بیدار ہو جائے گا۔ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ۔ (۸۱/۶) جب سمندر جہازوں اور کشتیوں سے معمور ہو جائیں گے۔ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ جب آبادیاں یہاں سے وہاں تک ملتی ہوئی چلی جائیں گی۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ۔ (۸۱/۱۰) جب کتابیں، مجلات، اخبارات، بہت زیادہ پھیل جائیں گی۔ وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ۔ (۸۱/۱۱) جب آسمانی کرّوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے جائیں گے۔ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ۔ وَاَلْقَتْ مَا فِیْھَا وَتَخَلَّتْ۔ (۸۴/۳-۴) جب ذرائع رسل و رسائل کے عام ہو جانے سے زمین پھیل جائے گی اور اپنے معدنی ذخائر کو باہر نکال پھینکے گی اور اس طرح اندر سے خالی ہو جائے گی۔ یہ تو خارجی کائنات میں رونما ہونے والے انقلابات کی نشاندہی ہے —— خود انسانی دنیا کے اندر بھی ایک عظیم انقلاب آئے گا۔ اور وہ یہ کہ —— وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ۔ (۸۱/۸-۹) جب عورت کہ جسے مردوں کے استبداد نے زندہ درگور کر رکھا ہے، انسانیت کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور وہاں یہ سوال پوچھا جائے گا کہ اسے بالآخر کس جرم کی پاداش میں مدفون رکھا گیا تھا۔ یعنی اس دور میں صرف زمین کے مدفون خزانے ہی ابھر کر باہر نہیں آئیں گے، انسانوں کے ہاتھوں کی دفن کردہ مظلوم عورت بھی دوبارہ زندہ ہو کر سطحِ انسانیت پر آ جائے گی۔ یہ ہے وہ دور جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ انسانیت، خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اور نظامِ سرمایہ داری الٹ جائے گا۔

لیکن یہ کچھ کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رُو سے نہیں ہوگا۔ جس میں انسان کے لئے وہ جذبۂ محرکہ نہیں ہوتا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور کم از کم اپنے لئے رکھ کر، باقی دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بڑھنا و رغبت دے دے۔ نہ ہی ان کے ہاں مستقل اقدار و مطلق معیارِ حق و باطل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظام میں یہ کچھ (REGIMENTATION) کے ذریعہ کرنا پڑتا ہے جس سے فرد کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم جو نظام لاتا ہے اس میں اتنا ہی نہیں ہوتا کہ ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہتی ہیں،

کمیونزم کے ذریعے نہیں

بلکہ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے۔ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ (۸۲/۱۹) کسی فرد کا دوسرے فرد پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار نہیں ہوتا۔ اس میں ہر فرد کو مقامِ آدمیت نصیب ہوتا ہے اور وہ شرفِ انسانیت سے بہرہ یاب و سرفراز ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نظام میں آئین و قوانین بھی باقی نہیں رہتے۔ اور معاشرہ (کمیونزم کے فلسفہ کے مطابق) لامملکتی اور لاقانونی ہو جاتا ہے۔ نہیں۔ اس میں لاقانونیت نہیں پھیلتی۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ: وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ۔ (۸۲/۱۹) اس میں تمام معاملات، خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) انسانوں کا نہیں، خدا کے غیر متبدل قوانین کا ہوتا ہے۔ اس میں مستقل اقدار اور مطلق معیارِ حق و باطل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یوں اس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔ ؎

کس در ایں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہ ہوگا وہ دور جس کے متعلق کہا کہ ——— يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ (۱۴/۴۸) اُس وقت یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا۔ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا۔ (۳۹/۶۹) اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

آخری سہارا

یہ ہے وہ نظامِ ربوبیت، جو انسانیت کا آخری سہارا ہے اور جس سے، جنت سے نکلا ہوا آدم، پھر سے جنت کو پا لے گا۔ قرآن کی رُو سے انسان کا انجام تباہی نہیں، سرفرازی و سربلندی ہے۔ اس کے سفرِ حیات کا مآل، پستیوں کے عمیق غار نہیں، بلکہ: لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ (۸۴/۱۹) اس شہسوار کو بلند سے بلند تر مقامات کی طرف چڑھتے جانا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام!
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

عصرِ حاضر کی بے پناہ تاریکیوں میں قرآن کا پیغام ہی وہ روشنی کا مینار ہے جو طوفانوں میں گھری ہوئی کشتیٔ انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ اقبالؒ کی آنکھ نے قرآنی بصیرت کی رُو سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا کہ ——— "جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے" ——— اقبالؒ نے اس نئی دنیا کا ایک دھندلا سا خاکہ دیکھا تھا لیکن اب زمانے کے تقاضوں سے وہ دھندلاہٹ آہستہ آہستہ چھٹ رہی ہے۔ اور وہ دنیا جسے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں تعمیر کر رہی تھی، اُفقِ کائنات

سے اُبھر کر سامنے آ رہی ہے ——— انسان کا موجودہ عالمگیر اضطراب، مایوسیوں کا پیغامِ مرگ نہیں، امیدوں کی نشیبِ حیات ہے۔ یہ وہ خزاں ہے جو آنے والی بہار کے لئے طائر پیش رس ہوتی ہے۔ یہ وہ آخری شب کی تاریکی ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

دیکھنا یہ ہے کہ اس خورشیدِ جہانتاب کی پہلی کرنوں کی جبیں بوسی کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصّے میں آتی ہے۔ جس کے نصیب میں یہ سعادت ہو گئی، اسی کی قسمت میں نوعِ انسان کی امامت، (لیڈر شپ) ہو گی۔

اور یہی ہے طلوعِ سحر کی وہ یقین آفریں امید جس کی وجہ سے، میں بھی یہ کہتے ہوئے اس پیکرِ محبوبیت کا دامن تھامے بیٹھا ہوں کہ ؎

تیرے سوا کوئی شائستۂ دعا بھی تو ہو!
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں

اقبالؒ کی دلی آرزو تھی کہ یہ سعادت اسی خطۂ زمین کو نصیب ہو۔ اسی کے لئے اس نے پاکستان کا تصوّر عطا کیا تھا ——— اور اسی لئے میں بھی اس خطۂ ارض کی حفاظت اور سالمیت کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرستانہ ذہنیتیں اس کے راستے میں بُری طرح روک بن کر کھڑی چلی آ رہی ہیں لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں۔ اور ایک فقیرِ بے نوا کی طرح اپنی اس صدا کو برابر دھرائے جا رہا ہوں کہ: ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

والسلام

ایک حسین و سادہ تقریب

معمول کے مطابق ہر سال اکتوبر کے مہینے میں طلوعِ اسلام کا سالانہ کنونشن منعقد ہوا کرتا ہے۔ امسال ملک کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے کنونشن کا انعقاد نہ ہو سکا لیکن وابستگانِ دامنِ قرآنی کی شدتِ شوق نے اپنے مل بیٹھنے کی تقریب پیدا کر لی۔ اس کے لئے ۱۷-۱۸ اکتوبر کو جشنِ قرآنِ عظیم کے عنوان سے ایک اجتماع ہوا جس میں ملک بھر کی طلوعِ اسلام کی بزموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ۱۷ اکتوبر کو تمام نمائندگان کی خصوصی نشستیں ہوتی رہیں لیکن ۱۸ اکتوبر کی صبح مفکرِ قرآن کا خصوصی درس ہوا جس کا مقصد ان کی تازہ ترین مایہ ناز تصنیف ہوا کتاب — **تبویب القرآن** — کا تعارف تھا۔ اس اجتماع کا آغاز صبح ۹ بجے تلاوتِ قرآن مجید اور کلامِ اقبال سے ہوا۔ اس کے بعد بزمِ کراچی کے نمائندہ، محترم محمد اسلام صاحب نے استقبالیہ پیش کیا جو چند صفحات آگے چل کر درجِ اشاعت حاضرہ ہے۔ ازاں بعد عندلیبِ گلستانِ قرآنی، محترمہ ثریا عندلیب نے، اپنے منفرد اندازِ تحریر اور اسلوبِ بیان سے، بحضورِ ربّ العرش، سجدۂ شکرانہ گذارا۔ ان کا یہ وجد آفریں مقالہ آئندہ پرچہ میں اشاعت پذیر ہو گا۔ اس کے بعد بزمِ کراچی ہی کے ایک رکن محترم افتخار الحق صاحب نے تبویب القرآن کا تفصیلی تعارف کرایا۔ اور آخر میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب نے ایسا خصوصی درس عطا فرمایا جو بصیرت افروز بھی تھا اور دل گداز بھی۔ موضوع تھا — مملکتِ پاکستان میں قرآن کا مقام —۔ ان کے درس چونکہ فی البدیہہ ہوتے ہیں اس لئے وہ ٹیپ ریکارڈر ہی میں تو محفوظ ہو جاتے ہیں ضبطِ تحریر میں نہیں آتے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے پر مشتمل اس درس میں سامعین کی محویت کا وہ عالم تھا جس کا نقشہ بیدل نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ — مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را — بزمِ کراچی کے وابستگانِ فکرِ قرآن نے درس گاہ کو جمالِ عروسی عطا کر دیا تھا۔ شرکاء کی کثرت تنگیٔ داماں کی گلہ سنج تھی۔ درس کے اختتام پر ہر ایک کی زبان پر اس قسم کے الفاظ تھے کہ ایسی حقیقت کشا اور اس کے ساتھ ہی دلسوز محفلوں کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

تبویب القرآن کے (تین جلدوں پر مشتمل) مجلد نسخے تیار ہو کر آ گئے تھے جنہیں اربابِ ذوقِ قرآن نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ اور یوں اُن کے صبر آزما انتظار کی مدت بحسن و خوبی اختتام تک پہنچی ——— فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابوں کی کہانی

وہ منفرد معلومات افزا کتاب جس کا پہلا ایڈیشن ایک عرصہ سے ختم ہو گیا تھا دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب کی ہدایت آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں، کن مراحل سے گزریں اور اب وہ کس شکل میں ہیں — تورات - انجیل - وید - دھرم شاستر - رامائن - مہابھارت - ژند اوستا (مذہبِ زرتشت) - بدھ مت کی کتابیں - جین مت کی کتابیں - اہلِ چین (کنفیوشس ازم) کی کتابیں - اہلِ جاپان (شنٹو ازم) کی کتابیں۔ ان کی پوری تاریخ اور آخر میں اس حقیقت کا تفصیلی بیان کہ قرآن مجید پہلے دن سے ایک مرتب کتاب کی شکل میں دنیا میں محفوظ چلا آ رہا ہے۔ اس کتاب سے جہاں ان مذاہب کے متعلق عجیب و غریب معلومات حاصل ہوں گی وہاں مفکرِ قرآن کی وسعتِ مطالعہ اور تعمیقِ تحقیق کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔ سفید کاغذ پر عمدہ کتابت، طباعت، مجلد، گرد پوش۔ قیمت ۱۲/- روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ } (۱) مکتبۂ دین و دانش، چوک اردو بازار، لاہور۔ (۲) ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵-بی گلبرگ ۲، لاہور

ادارۂ طلوعِ اسلام کی
مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ :- ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن پارہ اوّل	-/۵ روپے
" " پارہ نمبر ۲ تا پارہ نمبر ۲۷	-/۳ " (فی پارہ)
" " پارہ نمبر ۲۸ و ۲۹ (یکجا)	-/۷ روپے
" " پارہ نمبر ۳۰	-/۵ "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد) (تین جلدوں میں)	-/۱۲۰ "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ بکھلیہ پارے)	-/۹۵ "
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلد ۴ جلدوں میں)	-/۱۰۰ "
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	-/۴۰ "
مطالب الفرقان (جلد دوم)	-/۵۰ "
تبویبُ القرآن (مکمل سیٹ) (تین جلدوں میں)	-/۱۶۰ روپے
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ ایڈیشن مجلد)	-/۱۵ "
من و یزداں (مجلد)	-/۲۵ "
ابلیس و آدم "	-/۲۵ "
جوئے نور "	-/۲۵ "
برقِ طور "	-/۲۵ "
شعلۂ مستور "	-/۲۵ "
جہانِ فردا "	-/۲۵ "
کتاب التقدیر "	-/۳۰ "
معراجِ انسانیت "	-/۴۵ "
شاہکارِ رسالت "	-/۴۵ "
اقبال اور قرآن "	-/۲۵ "
انسان نے کیا سوچا؟ (مجلد)	-/۲۰ "
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں (جدید ایڈیشن)	-/۱۲ "

نام کتاب	قیمت
ISLAM A CHALLENGE (BOUND EDITION)	-/۴۰ روپے
ISLAM A CHALLENGE (PAPER BACK EDITION)	-/۲۵ "
سلسبیل	-/۱۰ "
فردوسِ گم گشتہ	-/۱۰ "
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	-/۱۵ "
سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ)	-/۳۶ "
طاہرہ کے نام خطوط	-/۶ "
مقامِ حدیث (جدید ایڈیشن)	-/۱۰ "
اسلامی معاشرت	-/۴ "
اسبابِ زوالِ اُمت (جدید ایڈیشن)	-/۴ "
قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ) (۳ جلدیں)	-/۲۵ "
(جلد۔ دوم۔ سوم۔ جدید ایڈیشن)	
جہاد	۲/۵۰ "

نام کتاب	قیمت
عربی خود سیکھئے (جدید ایڈیشن)	-/۱۰ روپے
پاکستان کا معمارِ اوّل	۳/۵۰ "
فجر الاسلام (جلد اوّل)	-/۵ "
فجر الاسلام (جلد دوم)	-/۵ "
منزل بہ منزل	-/۸ "
قتلِ مرتد	-/۲ "
عالم گیر انسانیے	-/۱ روپیہ
جمع القرآن	-/۳ روپے
پرنسپل آف لامیکنگ اِن اسلام	-/۳ "
تاریخ الاُمت (مکمل سیٹ) (آٹھ جلدیں)	-/۲۸ "
تصنیفات ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	
PHENOMENA OF NATURE & QURAN	-/۵۰ "
CONSPIRACIES AGAINST QURAN	-/۴۰ "

ملنے کے پتے

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور

(۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

کراچی کے خریداران متوجہ ہوں!

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات دفترِ بزمِ طلوع اسلام، کمرہ نمبر ۳ A اورینٹ منشن۔ بالمقابل میری ویدر ٹاور۔ ایم اے جناح روڈ۔ کراچی ۲ (فون نمبر 238826) سے صبح ۹ تا ۵ بجے شام حاصل کی جاسکتی ہیں نیز اس پتہ پر پوسٹ کارڈ تحریر کرکے بھی منگائی جاسکتی ہیں۔ (نمائندہ بزم کراچی)

ضرورتِ رشتہ

انگلستان میں مقیم ایک پاکستانی ڈاکٹر ڈینٹل سرجن اور اسکی ہمشیرہ ڈینٹل سرجن (یہ دونوں لندن یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ہیں) کیلئے ڈاکٹری پاس رشتے مطلوب ہیں۔ (خط و کتابت بصیغہ راز)

اے۔ م

معرفت ادارہ طلوع اسلام۔ گلبرگ نمبر ۲ لاہور

ضروری اعلان

بوجہ گرانی و مہنگائی کی وجہ سے یکم جنوری ۱۹۷۸ء سے طلوع اسلام کا سالانہ چندہ برائے خریدارانِ پاکستان چوبیس (۲۴) روپے اور قیمت فی پرچہ دو (۲) روپے ہوگی۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر جمعہ ½۹ بجے صبح (فون [illegible]) ۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲۔ (نزد پولیس اسٹیشن)

لائلپور میں ہر جمعہ ½۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوع اسلام (بالمقابل چکی) اقبال بازار۔

لیہ میں ہر ہفتہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر خان کے مکان (نمبر ۱۳۵ وارڈ نمبر ۲) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)۔

جام پور میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) بلمقابل جنرل اسٹور۔ اڈہ روڈ (ڈیرہ غازیخاں)

کراچی میں (عارضی طور پر) ہر جمعہ ½۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کمرہ نمبر ۳A اورینٹ منشن بالمقابل میری ویدر ٹاور ایم اے جناح روڈ (ٹیلی فون نمبر 238826)

ملتان میں ہر جمعہ صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ) (فون ۷۲۰۷۱) دفتر شاہ سنٹر۔ بیرون پاک گیٹ

لائلپور میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۴۹۳) ۶۵ کوتوالی روڈ بکھیات سرجری کلینک)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی۔ مجیب روڈ۔ (بذریعہ ٹیپ)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶ لیاقت روڈ۔

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزمِ طلوع اسلام (بازار کلاں)